کتاب و سنت اور اسلافِ امت کی تعلیمات کا علمبردار

ماہنامہ

اشرف الجرائد

حیدرآباد

Volume:19 Issue:3 Marchh 2026

مدیر

مولانا محمد عبدالقوی

عید مبارک

ادارہ اشرف العلوم ٹرسٹ حیدرآباد

www.ashrafululoomhyd.com

EID MUBARAK

اشرف الجرائد میں شامل تمام مضامین کی تمام جزئیات سے مدیر کا اتفاق ضروری نہیں

آئینۂ مضامین

اشرف الجرائد کی توسیع و اشاعت میں حصہ لے کر اشاعتِ دین کا ثواب حاصل فرمائیں۔ ادارہ

درسِ قرآن



دوامِ عمل عند اللہ محبوب ہے

از: مولانا شیخ عبدالقادر فرید قاسمی*

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ　بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

یَاأَیُّھَا الَّذِیْنَ آمَنُوا اصْبِرُوا وَصَابِرُوا وَرَابِطُوا وَاتَّقُوا اللّٰہَ لَعَلَّکُمْ تُفْلِحُوْنَ ۔

(ال عمران: ۲۰۰)

ترجمہ: اے ایمان والو! صبر کرو، صبر میں مقابلہ کرو، سرحدوں کی حفاظت کرو اور اللہ تعالی سے ڈرو؛ تاکہ تم کامیاب ہوجاؤ۔

تشریح: سب سے پہلی چیز صبر ہے، صبر کے لغوی معنی: حبس النفس علی ماتکرہ یعنی نفس کو اس چیز پر رُوکنا اور ثابت قدم رکھنا جو اس کو ناگوار گذرے، اور عرف میں مصیبت کو برداشت کرنے کا نام صبر ہے؛ جب کہ اصطلاحِ شرع میں یہ بہت وسیع مفہوم رکھتا ہے، چناں چہ شرعی صبر کی تین قسمیں ہیں: صبر علی الطاعۃ، صبر علی المصیبۃ اور صبر عن المعصیۃ ۔ صبر علی الطاعۃ کا مطلب یہ ہے کہ آدمی جو بھی نیکی اور اطاعت کا کام کرے، اس پر دوام اختیار کرے، اس کو پابندی سے انجام دیتا رہے، ہمیشہ اس کو کرتا رہے، ایسا نہ ہو ایک دن تو خوب جی بھر کے کرلیا؛ لیکن دوسرے دن کچھ بھی نیک کام نہیں کیا، ایک دن تو سو رکعت نفل پڑھے؛ لیکن دوسرے دن دو رکعت نفل بھی نہ ادا کرسکے، ایک دن تو مکمل قرآنِ مجید پڑھے؛ لیکن دوسرے دن ایک پارہ بھی تلاوت نہ کرسکے، ایسا عمل رب ذوالجلال کو زیادہ پسندیدہ نہیں ہے؛ بل کہ زیادہ پسندیدہ عمل وہ ہے کہ جس پر مداومت ہو، پابندی ہو، تسلسل ہو، ناغہ نہ ہو، چناں چہ ایک حدیثِ پاک میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس مضمون کو اس طرح بیان کیا ہے: "أحب الاعمال الی اللہ أدومھا وان قل" (بخاری، کتاب الرقاق، باب القصد والمداومۃ علی العمل، ٦٤٦٤) کہ خدائے وحدہٗ لاشریک لہٗ کو وہ عمل زیادہ پسندیدہ ہے جس کو ہمیشگی اور پابندی سے انجام دیا جائے؛ خواہ وہ عمل معمولی اور تھوڑا ہی کیوں نہ ہو۔ یہاں ایک بات کی وضاحت کردینی مناسب ہے کہ حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

* ذمہ دار ادارہ حسیب المدارس، گھٹکیسر، حیدرآباد

نے لفظِ " احب " یعنی اسمِ تفضیل کا صیغہ استعمال فرمایا ہے، جس کا مطلب یہ ہوا کہ ہر نیک عمل اللہ کو پسند ہے؛ خواہ اس پر مداومت ہو یا نہ ہو، ہاں پابندی سے کیا جانے والا عمل زیادہ پسند ہے۔ دراصل دوامِ عمل کی وجہ سے ہی عمل میں برکت ہوتی ہے، اسی کی وجہ سے نصرتِ خداوندی نازل ہوتی ہے، اسی کی بدولت آدمی روز بروز اعمال میں ترقی کرتا ہے، اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اسْتَعِينُوا بِالصَّبْرِ وَالصَّلَاةِ ۚ إِنَّ اللَّهَ مَعَ الصَّابِرِينَ (اے ایمان والو! صبر اور نماز کے ذریعے اللہ تعالیٰ سے مدد طلب کرو، بے شک اللہ تعالیٰ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے)۔ چناں چہ اللہ کے پیارے حبیب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا بھی یہی معمول تھا کہ جو بھی عمل کرتے، پابندی اور تسلسل کے ساتھ انجام دیتے، اگر کبھی ناغہ بھی ہو جاتا تو اس کی قضا کر لیتے؛ لہٰذا ہم جو بھی عمل کریں پابندی کے ساتھ کرنے کی عادت ڈالیں۔

بہر حال! کامیابی کی بنیاد چار چیزیں ہیں، ان میں سے دوسری چیز مصابرہ ہے، مصابرہ کے معنیٰ ایک دوسرے سے صبر میں مقابلہ کرنا، یعنی ہر ایک اپنے اندر یہ جذبہ پیدا کرے کہ میں دوسروں سے زیادہ صبر کروں، میں صبر میں سب سے آگے بڑھوں، میں سب سے بڑا صابر بنوں۔ تیسری چیز مرابطہ ہے، مرابطہ کے معنیٰ: سرحدوں کی حفاظت کرنے کے ہیں، سرحد سے جغرافی سرحد بھی مراد ہو سکتا ہے اور اور نظریاتی سرحد بھی! یعنی ملکی سرحد کی حفاظت کرنے اور صحیح عقائد و افکار کی حفاظت کرنا۔ چوتھی چیز تقویٰ ہے، اوامر کو کرنا اور نواہی سے بچنا تقویٰ کہلاتا ہے۔ پس جس مسلمان کے اندر یہ چاروں خوبیاں پیدا ہو جائے وہ ایک کامیاب اور فلاح یاب مسلمان ہے، وہ خوش بخت و خوش نصیب مسلمان ہے، لہٰذا ہم میں سے ہر مسلمان کو بھرپور کوشش کرنی چاہیئے کہ خوش بخت مسلمانوں کی فہرست میں شامل ہوں۔

خوشی کی بات تو یہ ہے کہ ابھی جو ایام چل رہے ہیں، وہ ہمارے لیے ایک بڑی غنیمت ہے، ہمارے لیے اچھا موقع ہے کہ ہم صبر کی عادت ڈالیں، ایک دوسرے سے صبر میں مقابلہ کریں، تقویٰ اختیار کریں، کیوں کہ ہنوز شیطان کا زور کم یا بالکل نہیں رہتا ہے، شیطان ہمارے اوپر کسی طاقت کا استعمال نہیں کر سکتا، کیوں کہ فرمانِ نبوی کے مطابق ماہِ رمضان المبارک میں شیاطین جکڑ دیے جاتے ہیں، نیز حضورِ پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس ماہ کو صبر کا مہینہ قرار دیا ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ اس مہینے میں صبر کی ٹریننگ ہوتی ہے، صبر کی مشق ہوتی ہے، یہ صبر کرنے کی تربیت کا مہینہ ہے۔

دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہم سب کو اپنے نیک اعمال پر مداومت کی توفیق نصیب فرمائے۔ آمین

درسِ حدیث



معتکف گناہوں سے محفوظ رہتا ہے

از: مولانا مفتی محمد احمد علی قاسمی*

عَنْ ابْنِ عَبَّاسٍ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰہ ﷺ قَالَ فِی الْمُعْتَکِفِ : ھُوَ یَعْکِفُ الذُّنُوْبَ ،وَیَجْرِیْ لَهٗ مِنَ الْحَسَنَاتِ کَعَامِلِ الْحَسَنَاتِ کُلِّھَا (رواہ ابن ماجہ:1714)

ترجمہ:۔حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اعتکاف کرنے والے کے بارے میں فرمایا: کہ وہ اعتکاف کی وجہ سے گناہوں سے بچا رہتا ہے، اور اس کے لیے اتنی ہی نیکیاں لکھی جاتی ہیں جتنی کہ کرنے والے کے لیے ہیں۔

تشریح: رمضان المبارک کا بابرکت و مقدس مہینہ اور اس میں خاص طور پر روزہ کی فرضیت دراصل روح کی تربیت و ترقی کے لیے ہے، سال کے 11 مہینوں میں ماحول و حالات کی پراگندگی اور نفسانی و شیطانی حملوں کی وجہ سے جو روحانی و ایمانی قوتیں متاثر ہو کر مغلوب ہو چکی تھیں اس کو غالب کرنے اور نفسانی قوتوں کو مغلوب کرنے کے لیے یہ عظیم مہینہ دیا گیا ہے، خلاصہ یہ کہ رمضان کا خاص نورانی ماحول، روزہ کا مجاہدہ اور شب کے قیام کا مقصد باطن میں "ملکوتیت" کو غالب کرنے اور "بہیمیت" کو مغلوب کرنے کے لیے ہے، اور پھر اس مہینہ کے آخری عشرہ کا اعتکاف مزید ان صلاحیتوں کو پروان چڑھانے اور ملاءِ اعلیٰ سے خصوصی مناسبت پیدا کرنے کے لیے ہے، اعتکاف کا معنیٰ جمے رہنے اور خود کو روک لینے کے ہیں، اور شرعی اصطلاح میں رمضان کے آخری عشرہ میں عبادت کی نیت سے مسجد میں ٹھہرے رہنے کو اعتکاف کہا جاتا ہے، اعتکاف حضور اکرم ﷺ کی دائمی سنت اور عظیم عبادت ہے، جو تقربِ الٰہی کا عظیم وسیلہ اور روحانی تربیت و ترقی کا اہم ذریعہ ہے، جس میں معتکف دنیا اور اہلِ دنیا کے سارے علاقوں سے کٹ کر مولیٰ تعالیٰ کے آستانے پر پڑ جاتا ہے، اسی کے ذکر و فکر تسبیح و تقدیس اور اس کے حضور میں توبہ و استغفار انابت و رجوع کا ایسا لامتناہی سلسلہ رہتا ہے کہ گویا بہ زبانِ حال کہتا ہے۔

* استاذ حدیث وفقہ ادارہ اشرف العلوم حیدرآباد

نکل جائے دم تیرے قدموں کے نیچے
یہی دل کی حسرت یہی آرزو ہے

امام ابن قیم رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں: کہ اعتکاف کا مقصود اور اس کی روح دل کو اللہ کی پاک ذات کے ساتھ وابستہ کر لینا ہے کہ سب طرف سے ہٹ کر اسی کے ساتھ مجتمع ہو جائے، اور ساری مشغولیوں کے بدلے میں اسی کی پاک ذات سے مشغول ہو جائے، اور اس کے غیر کی طرف سے منقطع ہو کر اُس طرح اس میں لگ جائے کہ خیالات و تفکرات سب کی جگہ اُس کا پاک ذکر اس کی محبت سما جائے؛ حتیٰ کہ مخلوق کے ساتھ اُنس کے بدلہ اللہ کے ساتھ اُنس سے پیدا ہو جائے، کہ یہ اُنس قبر کی وحشت میں کام دے؛ کہ اس دن اللہ کی پاک ذات کے سوا نہ کوئی مونس نہ دل بہلانے والا، اگر دل اس کے ساتھ مانوس ہو چکا ہوگا تو کس قدر لذت سے وقت گزرے گا۔

جی ڈھونڈتا ہے پھر وہی فرصت کے رات دن
بیٹھا رہوں تصورِ جاناں کیے ہوئے

نیز اس میں ہر وقت عبادت میں مشغولی ہے کہ آدمی سوتے جاگتے ہر وقت عبادت میں شمار ہوتا ہے، اور اللہ کے ساتھ تقرب ہے، حدیث میں ہے کہ جو شخص میری طرف ایک ہاتھ قریب ہوتا ہے میں اس سے دو ہاتھ قریب ہوتا ہوں، اور جو میری طرف آہستہ بھی چلتا ہے میں اس کی طرف دوڑ کر آتا ہوں، نیز اس میں اللہ کے گھر پڑ جانا ہے، اور کریم میزبان ہمیشہ گھر آنے والے کا اکرام کرتا ہے، نیز اللہ کے قلعے میں محفوظ ہونا ہے؛ کہ دشمن کی رسائی وہاں تک نہیں، وغیرہ وغیرہ، بہت سے فضائل اور خواص اس اہم عبادت کے ہیں" (فضائل اعمال:779)

اعتکاف کے انہی روحانی و ایمانی فوائد کی وجہ سے دورِ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے لے کر تا حال ہر دور میں امت کے خواص کا اس عمل کے ساتھ خاص التزام و اہتمام رہا ہے، اور اس کی برکاتِ خاصہ کا عملی زندگی میں (تقویٰ و طہارتِ باطنی کے اعتبار سے) مشاہدہ بھی ہوتا ہے۔

زیرِ نظر حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اعتکاف کے دو مخصوص منافع بیان فرمائے ہیں؛ ایک تو اعتکاف کی وجہ سے معتکف گناہوں سے مکمل محفوظ رہتا ہے، اس لیے کہ وہ گناہ اور اسبابِ گناہ سے دور، مسجد کے نورانی ماحول میں صبح و شام گزارتا ہے، دوسرا نفع یہ ہے کہ چونکہ معتکف اپنے اعتکاف کی وجہ سے دوسری وہ بہت ساری عبادتیں (عیادتِ مریض، جنازہ میں شرکت وغیرہ) انجام نہیں دے سکتا، جس کے لیے اس کو مسجد سے باہر نکلنا پڑتا ہے، اور وہ مسجد سے باہر نہیں جا سکتا؛ لیکن اس کے باوجود اللہ تعالیٰ کی فیاضی اور شانِ کریمی ہے کہ اس کے لیے وہ ساری نیکیاں لکھ دیتا ہے، جو اعمال کے درجے میں اگرچہ اس نے انجام نہیں دیا ہے۔

اللہ کے وہ بندے جنھیں فرصت اور صحت سازگار ہو تو انھیں ضرور اس عبادت کا اہتمام کرنا چاہیے۔

پیش گفتار

مدارس کی بدلتی ضرورت اور عصری تعلیم کا تقاضا

از: مدیر

ایم، ایس ایجوکیشن کمیٹی کی جانب سے مدارسِ اسلامیہ کے طلبہ کے لئے مرتب کردہ عصری علوم کے ایک نصاب کی تعارفی مجلس میں کیا گیا خطاب جو مجلسِ علمیہ تلنگانا و آندھرا کے تحت مدرسہ سبیل الفلاح میں منعقد کی گئی تھی۔ از مرتب

نہایت قابل احترام اکابرین عظام، دور و نزدیک سے تشریف لائے ہوئے محترم اساتذہ کرام اور ذمہ داران مدارس!

موضوع بہت حساس اور نازک ہے۔ میں ہمارے محترم نائب ناظم مجلس علمیہ کو یقین دلانا چاہتا ہوں کہ آپ اکیلے نہیں، ہم بھی "ماڈرن مولوی" کا طعنہ 15 برس سے سن رہے ہیں اور اپنا کام جاری رکھے ہوئے ہیں۔[1] یہ تبصرے ہمارے حوصلے پست کرنے کے بجائے بڑھاتے ہیں۔ ہمیں ایسے تبصرہ کرنے والوں کو ایک درجے میں معذور سمجھنا چاہیے، کیوں کہ ہم نے ابھی تک انہیں مدارس میں عصری تعلیم کی ضرورت کا قائل ہی نہیں کرایا۔

مدارس کا مقصد اور قومی زبان سے دوری

مدارس کا مقصد صرف حافظ اور عالم بنانا نہیں ہے، بلکہ دین اسلام اور مسلمانوں کی حفاظت ہے۔ اس مقصد کے لیے عالم کو بہت سی صلاحیتوں اور وسائل کی ضرورت ہے۔ آج ہماری آنکھیں دیکھ رہی ہیں کہ تعلیم یافتہ

[1] چوں کہ انہوں نے اپنی تمہیدی گفتگو میں کہا تھا کہ بعض اہلِ مدارس اس تجویز پر اشکال و اعتراض کر رہے ہیں۔

مسلمانوں کی اکثریت نام نہاد اسلامک اسکالرز کے فالوورز بن چکے ہیں۔ وہ علمائے حق کو نہیں جانتے، ان کے قریب نہیں جاتے، اور اگر جاتے بھی ہیں تو ان کی ضرورت صرف دعا کے لیے سمجھتے ہیں۔ وہ لوگ ہمارے بیان نہیں سنتے، اس لئے نہیں کہ انہیں ہم سے عقیدت نہیں بل کہ اس لئے کہ ہم لوگ جو مدرستی اصطلاحات اور خالص اردو زبان کا استعمال کرتے ہیں وہ اُن کے لیے اجنبی ہوتی ہے۔

ہماری اردو زبان میں 50 فیصد الفاظ فارسی اور عربی کے ہوتے ہیں جبکہ ہماری قوم اردو میں اب 50 فیصد انگریزی الفاظ استعمال کرتی ہے۔ اگر عالم قوم کی زبان سے واقف نہیں ہوگا تو وہ اپنی بات ان تک کیسے پہنچا پائے گا؟ یہ ہماری زبان کی بے بسی ہے، جس کی وجہ سے ہمارے نوجوان ہمارا بیان سننے نہیں آتے۔ ہمیں قوم کی فہم کے مطابق بولنے والے علماء کو تیار کرنا ہے۔ ہمیں جو چیز نہیں آتی اس کا دشمن نہیں بننا چاہیے، بل کہ اگلی کھیپ کو دعوت کی ان ضرورتوں سے بخوشی آراستہ کرنا چاہیئے۔

دارالعلوم دیوبند کا واضح موقف اور نئی پالیسی

کچھ مدرسے والے یہ کہتے ہیں کہ دارالعلوم دیوبند کا ایسا منشاء نہیں ہے، اس لیے ہمیں یہ تبدیلی نہیں لانی چاہیے۔ لیکن میں آپ کو بتانا چاہتا ہوں کہ ابھی 19 ر دسمبر کو رابطہ مدارس اسلامیہ کی عاملہ کی میٹنگ میں حضرت مولانا سید ارشد مدنی صاحب دامت برکاتہم نے ابتدائی خطاب میں فرمایا کہ دارالعلوم دیوبند یہ چاہتا ہے کہ ہر دینی مدرسے میں عصری تعلیم شامل کی جائے۔" مولانا نے حضرت مہتمم صاحب سے مخاطب ہوکر یہ بھی فرمایا کہ "ایسا ضابطہ بنا دیجیے کہ دارالعلوم اس امیدوار کو داخلہ نہیں دے گا جس کے پاس دسویں کی سند نہیں ہوگی۔" اس کے بعد تو اب آپ کو یہ تبدیلی قبول کرنا ہی پڑے گی۔ (یہ بات حضرت مولانا مدظلہ نے اُس وقت یقیناً فرمائی تھی لیکن اس کے بعد والے سال حضرت مولانا نے اس کے برخلاف فرمایا تھا کہ مدارس میں عصری تعلیم مدارس کے لئے سمِ قاتل ہے، یہ بات مجھے سمجھ میں نہیں آئی تھی، جرأتِ بے جا کے ساتھ دونوں باتوں میں تضاد پر خلجان دور کرنا چاہا مگر اطمینان نہ ہوا، پھر جمعیت علماء ہند کی ایک میٹنگ میں جو مسجد عبدالنبی کے صحن میں منعقد ہوئی تھی، حضرت مولانا نے صراحت فرمائی کہ ''میں درسیات کے ساتھ عصری تعلیم مُضر سمجھتا ہوں، عالمیت کے آغاز سے قبل دسویں تک پڑھانے کے خلاف نہیں ہوں'' اس سے اُن کا حقیقی منشاء سامنے آیا کہ کم از کم دسویں تک عصری تعلیم ہونی چاہیئے لیکن عالمیت کا نصاب خود اتنا پُر مواد ہے کہ اس کے ساتھ کوئی دوسرا کام شامل کرنا اس کی روح کو نقصان پہنچا سکتا ہے۔ چوں کہ میرا زیر نظر بیان حضرت کے پہلے بیان کے بعد ہوا تھا اس لئے یہ صراحت دیانتاً ضروری سمجھا کہ بڑوں پر کوئی ریمارک نہ آئے۔)

ملت کی دعوتی و دفاعی ضرورت پہلے ہی سے یہ تبدیلی چاہتی تھی، لیکن اب ایک اور مصیبت نئی تعلیمی پالیسی کی شکل میں ہمارے سر پر کھڑی ہے۔ جب حکومت کا ڈنڈا پڑے گا تو ہمیں یہ تبدیلی ماننا ہی پڑے گی۔ حکومت یہ نہیں کہے گی کہ آپ بچوں کو اپنا مذہب نہ پڑھاؤ، وہ کہے گی کہ عصری تعلیم بھی پڑھاؤ۔ ہمیں قانون کے ذریعے ان کے مسلط ہونے سے پہلے خود ہی نظام بنالینا چاہیے۔

یہ تبدیلی اس لیے ضروری ہے تاکہ ہمارے علماء دین کی دعوت و دفاع کا فریضہ ادا کرسکیں، جو کہ ان کی بنیادی ذمہ داری ہے۔ آج تعلیم یافتہ طبقے کی بڑی تعداد کے افکار و نظریات ملحدانہ ہیں، انٹرنیٹ پر بیٹھے ملحدین ان کو زیادہ اپیل کرتے ہیں، اس کی وجہ یہ نہیں کہ وہ حق پر ہیں، بلکہ اصل وجہ یہ ہے کہ وہ ان کی فہم کے مطابق بات کرتے ہیں۔ حق ہمارے پاس ہے لیکن ہم ان کی زبان میں نہیں بول سکتے۔ مدارس میں عصری تعلیم کی سفارش سے ہمارا مقصد صرف یہ ہے کہ ہم اپنے علماء کو اس قابل بنائیں کہ وہ لوگوں کو دین اُن کی فہم کے مطابق سمجھا سکیں۔

ایک قابلِ عمل خاکہ اور درپیش مسائل

یہ جو نصاب اور نظام آپ کے سامنے پیش کیا گیا ہے یہ کوئی قطعی اور حتمی فیصلہ نہیں ہے۔ یہ صرف ایک تقریبی خاکہ[۱] ہے تاکہ یہ ثابت کیا جاسکے کہ دونوں تعلیم ساتھ ساتھ ممکن ہے۔ آپ میں سے بہت سے قابل حضرات ایسے ہیں جو اس سے بہتر نظام بنا سکتے ہیں۔ ہم صرف اتنا چاہتے ہیں کہ آپ اپنے مدارس میں عصری تعلیم بھی شامل کریں۔ کیسے کریں؟ یہ آپ خود طے کر لیجیے، ہم اسے آپ پر مسلط نہیں کرنا چاہتے، بلکہ صرف یہ بتانا چاہتے ہیں کہ یہ ناممکن نہیں ہے۔ البتہ یہ صحیح ہے کہ ہمیں اس نظام کو اپنانے سے پہلے چند مسائل پر غور کرنا ہوگا۔

ایک تو مالیاتی مسئلہ ہے کہ جب ہم عصری تعلیم کے اساتذہ کو رکھیں گے تو اُن کو ان کے معیار کے مطابق تنخواہ دینا پڑے گا۔ اس سے ہمارے بجٹ میں اضافہ ہوگا اور اس کے لیے مزید مالی وسائل کا انتظام کرنا ہوگا۔

دوسرے فکری و نظریاتی مسئلہ ہے کہ عصری تعلیم کے اساتذہ کو لانے سے ہمارے مدرسے کا ماحول متاثر ہوسکتا ہے، اس کے لئے ان کی تقرری سے پہلے ہمیں ان کی ذہنی اور فکری تربیت کرنی ہوگی تاکہ وہ ہمارے طلبہ کو کمرشیل سوچ دینے کے بجائے دین کی خدمت ہی کی ترغیب دے سکیں، تاکہ مدارس کا بنیادی مقصد متأثر نہ ہو۔

---

[۱] مجلسِ علمیہ نے اس اجلاس میں مدارس میں عصری تعلیم کا ایک خاکہ اور نصاب پیش کیا تھا، یہ بات اس سے متعلق ہے۔

یہ مسائل بہت اہم ہیں اور ہمیں ان پر سنجیدگی سے غور کرنا ہوگا۔ کسی پر تنقید کرنا یا دل آزاری کرنا میرا مقصد نہیں ہے، بلکہ میں چاہتا ہوں کہ ہم سب مل کر ان مسائل کا حل تلاش کریں۔ ہمیں مایوس نہیں ہونا چاہیے اور ہمت نہیں ہارنی چاہیے۔

اکابر کا راستہ اور جمود کا خاتمہ

ہمارے اکابر نے بھی ہر زمانے میں زمانے کی ضرورت کے مطابق فیصلے کیے ہیں۔ حضرت علامہ انور شاہ کشمیریؒ نے ایک صدی پہلے دارالعلوم میں شعبہ انگریزی قائم کرنے کا مشورہ دیا تھا تاکہ علماء جدید دور کے چیلنجز کا مقابلہ کرسکیں، یہ مشورہ بہ قول حضرت قاری عثمان صاحبؒ دارالعلوم کے ریکارڈ میں موجود ہے۔

حضرت مولانا خلیل احمد سہارنپوریؒ نے مدرسہ مظاہر علوم میں سنسکرت کو شامل نصاب کیا تھا تاکہ ہندوؤں کے ساتھ مناظروں میں دشواری نہ ہو، یہی نہیں جب اس کے لئے کوئی مسلم ماہر نہیں مل سکا تو غیر مسلم استاذ سے یہ کام لے لینے میں تک کوئی حرج نہیں سمجھا۔

ہمیں جمود اور تعطل سے بچنا چاہیے۔" تصلُّب اچھی بات ہے، تعصب اچھی بات نہیں ہے۔" ہمیں اپنے بڑوں سے رشتہ ختم نہیں کرنا چاہئے، ان کی نیتوں پر شک نہیں کرنا چاہیے۔ ساتھ ہی اس وقت امت کے لئے جو زیادہ بہتر ہو اُسے اپنانا چاہیئے، ہمارے بہت سے اکابر اس مسئلے پر غور کررہے ہیں اور جلد ہی اس کا کوئی حل پیش کریں گے۔

میں ہماری مجلس علمیہ کی خدمات کو خراج تحسین پیش کرتا ہوں اور بالخصوص بھائی عبداللطیف صاحب[1] اور ان کی ٹیم کا شکر گزار ہوں کہ انہوں نے مدارس کے طلبہ کے لئے ایک ایسا نصاب تیار کیا جو علمائے کرام اور گرایجویٹس دونوں کے نزدیک قابل قبول اور لائقِ عمل ہے۔

اللہ ہم سب کو عمل کی توفیق نصیب فرمائے۔ آمین۔

---

[1] ڈائریکٹر ایم ایس ایجوکیشن وملت فاؤنڈیشن

گوشۂ سیرت

حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو جہاد کا حکم

از: مرتب*

حضرت اسامہ بن زید بن حارثہؓ کا بیان ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے ایک گدھے پر سوار ہو کر حضرت سعد بن عبادہؓ کی عیادت کے لئے تشریف لے گئے، اور میں آپ کے پیچھے بیٹھا ہوا تھا، یہ اُس وقت کی بات ہے جب کہ ابھی جنگِ بدر نہیں ہوئی تھی، حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی سواری عبداللہ بن اُبی ابن سلول (مشہور منافق) کی ایک بیٹھک کے پاس سے گذری، اس وقت تک وہ مسلمان نہیں ہوا تھا، اور اس محفل میں مسلمان، مشرکین، اور یہود سبھی موجود تھے، مسلمانوں میں حضرت عبداللہ بن رواحہؓ بھی اس مجلس میں شریک تھے۔

جب سواری سے گرد وغبار پوری محفل پر چھا گیا تو ابن اُبی نے چادر سے ناک ڈھانک لی اور کہا کہ غبار مت اُڑاؤ۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے ان کو سلام کیا اور سواری سے اُتر کر وہاں ٹھیرے اور اُنھیں دعوتِ اسلام دی، اور قرآن پاک پڑھ کر سُنایا، عبداللہ بن اُبی بن سلول نے کہا: تم جو کہہ رہے ہو اگر وہ حق ہے تو اس سے اچھا تو میں بول نہیں سکتا، لیکن ہماری محفلوں میں آکر ہمیں ان باتوں سے تکلیفیں مت پہونچاؤ، اپنے گھر جاؤ کوئی تمہارے پاس آئے تو اُسے یہ قصے سناؤ۔

حضرت عبداللہ بن رواحہؓ نے کہا: اے اللہ کے رسول! ہماری محفلوں میں یہ باتیں ضرور بتایئے ہم اُسے پسند کرتے ہیں۔ مسلمان، مشرکین اور یہود میں زبان درازیاں شروع ہوگئیں قریب تھا کہ اُن میں ہاتھا پائی شروع ہوجاتی، حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم اُن کی باتیں سنتے رہے، جب وہ خاموش ہو گئے، تو وہاں سے آپ سواری پر سوار ہو کر حضرت سعد بن عبادہؓ کے پاس تشریف لے گئے۔

سعد سے مخاطب ہو کر فرمایا: سعد تم نے ابو حباب یعنی عبداللہ بن ابی کی باتیں نہیں سنیں؟ سعد نے جواباً عرض کیا: حضور! چھوڑیے، درگذر کیجئے، اس ذات کی قسم جس نے آپ پر کتابِ برحق نازل کی اور آپ کو حق دے کر مبعوث فرمایا۔ اس علاقے کے لوگوں نے طے کرلیا ہے کہ اس کی پیروی کریں گے، اس طرح اس کے اطراف ایک ٹولہ تیار ہو گیا ہے۔ بس اسی وجہ سے اس نے یہ برتاؤ کیا۔ جب حق تعالیٰ آپ کو دیئے ہوئے حق کے ذریعہ اس کا ردفرمائیں گے وہی حق غالب آکر رہے گا، چناں چہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے معاف کیا، آپ اور

آپ کے اصحابؓ کا معمول تکلیفوں پر صبر کرنا اور معاف کرنا ہی تھا۔ کیوں کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:
وَلَتَسْمَعُنَّ مِنَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتٰبَ مِن قَبْلِكُمْ وَمِنَ الَّذِينَ أَشْرَكُوا أَذًى كَثِيرًا وَإِنْ تَصْبِرُوا وَتَتَّقُوا فَإِنَّ ذٰلِكَ مِنْ عَزْمِ الْأُمُورِ (آل عمران:۱۸۶) (مسلمانو!) اور تم اہل کتاب اور مشرکین دونوں سے بہت سی تکلیف دہ باتیں سنو گے اور اگر تم صبر اور تقویٰ سے کام لیا کرو تو یقیناً یہی کام بڑی ہمت کے ہیں۔ (جو تمہیں اختیار کرنے ہیں)

اور ایسے حق تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَدَّ كَثِيرٌ مِّنْ أَهْلِ الْكِتَابِ لَوْ يَرُدُّونَكُم مِّن بَعْدِ إِيمَانِكُمْ كُفَّارًا حَسَدًا مِّنْ عِندِ أَنفُسِهِم مِّن بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُمُ الْحَقُّ ۖ فَاعْفُوا وَاصْفَحُوا حَتَّىٰ يَأْتِيَ اللَّهُ بِأَمْرِهِ ۗ إِنَّ اللَّهَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ (البقرہ:۱۰۹) (مسلمانو!) بہت سے اہل کتاب اپنے دلوں کے حسد کی بنا پر یہ چاہتے ہیں کہ تمہارے ایمان لانے کے بعد تمہیں پلٹا کر پھر کافر بنا دیں، باوجود یہ کہ حق ان پر واضح ہو چکا ہے۔ چناں چہ تم معاف کرو اور درگذر سے کام لو یہاں تک کہ اللہ خود اپنا فیصلہ بھیج دے، بے شک اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق ان لوگوں کی اذیتوں پر صبر فرماتے اور معاف کرتے رہتے یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے ان سے قتال کا حکم نازل فرمایا: چناں چہ جب غزوہ بدر پیش آیا اور سردارانِ قریش مارے گئے، تو عبداللہ بن ابی اور اس کا مشرک ٹولہ کہنے لگا، یہ معاملہ قابلِ توجہ ہو گیا ہے، پھر وہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ہاتھ پر بیعت کئے اور اسلام لے آئے۔ (دلائل النبوۃ:۲/۴۳۰)

گوشۂ خواتین

تربیتِ اولاد کے متعلق حضرت پیر صاحبؒ کی چالیس گذارشات

انتخاب وپیشکش: مولانا قاری محمد فیضان قاسمی*

(۱) اولاد اللہ کی امانت ہے......اور امانت میں کوتاہی صرف مار پیٹ نہیں...... بلکہ تربیت چھوڑ دینا بھی ہے۔!

(۲) بچے وہ نہیں کرتے جو آپ کہتے ہیں۔ بچے وہ کرتے ہیں جو آپ کرتے ہیں۔!

(۳) نماز کی تلقین سے پہلے گھر میں نماز کا ماحول بنائیں۔!

(۴) حرام لقمہ! اولاد کے دل سے نورِ ایمان چھین لیتا ہے۔!

(۵) جو والدین اولاد کے لیے دعا نہیں کرتے ......وہ اپنی طاقت کا سب سے بڑا ذریعہ کھو دیتے ہیں۔!

(۶) محبت کے بغیر تربیت ظلم ہے......اور تربیت کے بغیر محبت بگاڑ ہے۔!

(۷) ماں کی گود پہلی درسگاہ ہے......اور باپ کا کردار پہلی کتاب ہے۔!

(۸) اولاد کو وقت دینا سب سے قیمتی صدقہ ہے۔!

(۹) موبائل بچے کے ہاتھ میں نہیں...... بچے کا مستقبل اس کے ہاتھ میں دے دینا ہے۔!

(۱۰) جھوٹ بولنے والے والدین......سچ بولنے والی اولاد پیدا نہیں کرسکتے۔!

(۱۱) علم سے پہلے ادب سکھائیں......ادب آجائے تو علم خود راستہ بنالیتا ہے۔!

(۱۲) بُرا دوست......اولاد کے ایمان کا خاموش قاتل ہوتا ہے۔!

(۱۳) غصے میں دی گئی نصیحت......اصلاح نہیں......نفرت پیدا کرتی ہے۔!

(۱۴) ماں باپ کی لڑائیاں......بچوں کے دلوں کو عمر بھر کے لیے زخمی کردیتی ہیں۔!

(۱۵) اولاد کو اللہ سے جوڑیں......صرف سزا سے نہیں......محبت سے۔!

(۱۶) چھوٹی دعائیں......بڑی زندگیاں سنوار دیتی ہیں۔!

(۱۷) جو والدین کا ادب نہیں سیکھتا......وہ کسی کا ادب نہیں کر سکتا۔!

(۱۸) بچوں کو مال کم دیں......کردار زیادہ دیں۔!

(۱۹) بچوں کے سوال دبانے سے جہالت ختم نہیں......ضد پیدا ہوتی ہے۔!

(۲۰) غلطی پر تنہائی میں سمجھانا......اصل تربیت ہے۔!

(۲۱) نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سیرت......اولاد کی بہترین تربیتی کتاب ہے۔!

(۲۲) ہر خواہش پوری کرنا......اولاد کو مضبوط نہیں......کمزور بناتا ہے۔!

(۲۳) دین کو سخت بنا کر پیش نہ کریں......دین آسان ہے......ہم مشکل بنا دیتے ہیں۔!

(۲۴) حلال روزی......!صالح اولاد کی بنیاد ہے۔!

(۲۵) بے ترتیب زندگی......بے ترتیب کردار پیدا کرتی ہے۔!

(۲۶) والدین کی گالی......اولاد کی زبان خراب کرتی ہے۔!

(۲۷) دین جبر سے نہیں......سمجھ سے دل میں اترتا ہے۔!

(۲۸) اولاد کو ذمہ داری دیں......یہی خود اعتمادی کی کنجی ہے۔!

(۲۹) بچپن کی صحبت......زندگی کا رخ بدل دیتی ہے۔!

(۳۰) جو خود نہیں سِیکھتا......وہ صحیح سِکھا نہیں سکتا۔!

(۳۱) سادگی سِکھائیں......آسائش نہیں۔!

(۳۲) بچوں کی عزت کریں......وہ عزت کرنا سیکھ جائیں گے۔!

(۳۳) والدین کا معاف کرنا......اولاد کو سچائی سِکھاتا ہے۔!

(۳۴) حیاء......!ایمان کی پہچان ہے۔!

(۳۵) ہر مسئلے میں......اللہ کو یاد کرنا سِکھائیں۔!

(۳۶) اولاد کا موازنہ......حسد کا بیج بوتا ہے۔!

(۳۷) اچھا نام!......اچھی شناخت کی پہلی سیڑھی ہے۔

(۳۸) والدین کا باہمی احترام......اولاد کی خاموش تربیت ہے۔

(۳۹) صرف نیک بنانا کافی نہیں......نیکی پر قائم رکھنا بھی ضروری ہے۔

(۴۰) اولاد کی سب سے بڑی تربیت......والدین کی اپنی اصلاح ہے۔ (بہ شکریہ ماہنامہ دوائے دل)

گوشۂ رمضان

اللہ کو تھوڑا عمل پابندی کے ساتھ زیادہ پسند ہے

ازقلم: مولانا مفتی منور قاسمی*

حضورِ اکرم ﷺ کا ارشادِ گرامی ہے: "أحب الأعمال إلى الله أدومها وإن قل" (بخاری، کتاب الرقاق، باب القصد والمداومة على العمل، ٦٤٦٤) کہ خدائے رب ذوالجلال کی بارگاہ میں وہ عمل سب سے زیادہ محبوب ہے جس کو مداومت اور پابندی کے ساتھ انجام دیا جائے؛ خواہ وہ تھوڑا ہو۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ اگر کوئی آدمی ایک دن میں سو رکعت نفل نماز ادا کرتا ہے، پھر باقی ایام میں دو رکعت بھی نفل کی ادا نہیں کرتا، تو یہ اللہ رب العزت کو زیادہ محبوب نہیں ہوگا؛ بل کہ اگر کوئی آدمی روزانہ دو رکعت نفل پابندی کے ساتھ پڑھتا ہے، تو یہ عمل پہلے شخص کے عمل کے مقابلے میں زیادہ اہم اور فضیلت کا باعث ہوگا، حالاں کہ پہلے شخص کا عمل دوسرے کے مقابلے میں مقدار و کمیت میں زیادہ ہے۔ لہذا ہم جو بھی عمل کریں اس کو دوام اور پابندی کے ساتھ کریں، اور اپنے آپ کو اتنے ہی عمل کا پابند بنائیں جتنا کہ ہم روزانہ بلا ناغہ کرسکیں، چناں چہ حضورِ پاک ﷺ جس کام کو بھی کرتے تھے اس کو دوام اور پابندی کے ساتھ انجام دیتے تھے، جب کوئی کام دوام اور پابندی کے ساتھ مسلسل انجام دیا جاتا ہے، تبھی اس کا اثر بھی ظاہر ہوتا ہے؛ اگرچہ کہ وہ عمل قلیل ہو، مثال کے طور پر اگر آپ کسی پتھر پر بیک وقت اور یکبارگی ٹنکی بھر پانی انڈیلیں گے تب بھی اس پتھر پر کوئی نشان اور اثر ظاہر نہیں ہوگا، جب کہ وہی پانی اگر ایک ایک قطرہ مسلسل گرتا اور ٹپکتا، تو اس ٹپکنے اور گرنے کی وجہ سے پتھر پر نشان آجاتا، تو معلوم ہوا کہ پابندی کے ساتھ تھوڑا عمل زیادہ مفید ہے بغیر پابندی کے بہت عمل کے مقابلے میں۔

میرے بھائیو! اللہ تعالیٰ نے محض اپنے فضل و کرم اور توفیقِ خاص سے رمضان کا مبارک مہینہ ہم سب کو عطا فرمایا ہے، اور الحمدللہ ہم اس میں وہ کام انجام دے رہے ہیں جو غیرِ رمضان المبارک میں نہیں ہو پاتا ہے، یعنی کہ ہم اہتمام کے ساتھ پورے ماہ کے روزے رکھتے ہیں، پابندی سے جماعت کے ساتھ پنج وقتہ نمازیں ادا کرتے ہیں، وقت سے پہلے مسجد میں حاضر رہنے کی کوشش کرتے ہیں، سننِ قبلیہ و بعدیہ کو خشوع و خضوع کے ساتھ پڑھتے ہیں، تلاوت کا خوب اہتمام کرتے ہیں، صدقات و خیرات بھی دیتے ہیں، حاجت مندوں کی

* استاذ ادارۂ حبیب المدارس، گھٹکیسر

حاجتیں پوری کرتے ہیں، بیواؤں اور یتیموں کا خیال کرتے ہیں، نمازِ تہجد کو بھی ناغہ نہیں ہونے دیتے، ادھر ادھر کی فضولیات اور لغویات میں اپنا وقت ضائع نہیں کرتے ہیں۔ جھوٹ، غیبت، چغل خوری سے بچتے ہیں، جھگڑے سے دور رہتے ہیں، کسی کا حق نہیں دباتے ہیں، کسی کو دھوکہ نہیں دیتے ہیں، کسی پر الزام تراشی نہیں کرتے ہیں، کسی کو نہیں ستاتے ہیں، کسی پر ظلم نہیں کرتے ہیں، حرام کمائی سے پرہیز کرتے ہیں، ایمان کے منافی چیزوں سے کنارہ کشی اختیار کرتے ہیں، اپنی اصلاح کی خوب فکر کرتے ہیں، اللہ کے مقرب اور نیک بندوں کی فہرست میں شامل ہونے کی کوشش کرتے ہیں، ساری توجہات جنت کمانے کی طرف مبذول کرتے ہیں، اور ان تمام کاموں سے بچتے ہیں جو جہنم میں لے جانے کا سبب بن سکتے ہوں، الغرض؛ ہم اس ماہ میں بہت ساری نیکیوں کو کرتے اور بہت ساری برائیوں کو چھوڑتے ہیں، یہ بہت خوشی کی بات اور قابلِ تعریف ہے؛ لیکن ہمارے لیے سب سے زیادہ خوشی کی بات اس وقت ہوگی، جب کہ ہم رمضان المبارک گذرنے کے بعد بھی ان اعمال کی پابندی کریں، تلاوت کا اہتمام جس طرح رمضان المبارک میں ہوتا ہے تو ویسا ہی اہتمام رمضان المبارک کے بعد بھی ہونا چاہیے، تہجد کا اہتمام رمضان المبارک میں جیسے کرتے ہیں تو غیرِ رمضان میں بھی اس کی پابندی کریں، رمضان میں وقت سے پہلے مسجد میں حاضر ہوتے ہیں تو غیرِ رمضان میں بھی اس پر مواظبت کریں، اس ماہ میں کسی کو نہیں ستاتے ہیں تو دیگر ماہ میں بھی کسی کو تکلیف نہ پہونچائیں، اس ماہ میں کسی کی غیبت نہیں کرتے ہیں تو دیگر ماہ میں بھی کسی کی غیبت نہ کریں۔ اگر ہمارے اندر یہ خوبی پیدا ہوگئی تو یوں سمجھیں کہ ہمارا رمضان کامیاب ہوگیا؛ کیوں کہ کسی نیک عمل پر مداومت ومواظبت ہی اس کے مقبول ہونے کی علامت ونشانی ہے، اور اگر یہ صفت پیدا نہ ہوسکی تو رمضان میں کیے گئے اعمال پر ہمیں فکر مند ہونے کی ضرورت ہے کہ آخر کیا وجہ ہے کہ ہم ان پر پابندی نہیں کر پار ہے ہیں، کہیں ایسا تو نہیں کہ ہم نے ان مبارک گھڑیوں کو یوں ہی ضائع کر دیا۔

میرے دوستو! آپ ایک بات ذہن نشیں کرلیں کہ اللہ تعالیٰ نے یہ مبارک مہینہ ہم کو اس وجہ سے نوازا ہے تاکہ ہمیں خیر کے کام کرنے کی عادت پڑ جائے، اور برے کاموں کو چھوڑنے کی خصلت پیدا ہوجائے، گویا کہ مسلمانوں کے لیے یہ ماہ برائے مشق وتربیت ہے، کہ ایک مسلمان زیادہ ثواب کمانے کی فکر، جنت حاصل کرنے کے شوق اور جہنم سے نجات پانے کی خوشی میں اچھے اعمال کو اتنا زیادہ کرے کہ یہ ان کی طبیعت اور فطرت کا حصہ بن جائے، اور برے اعمال کو مسلسل ایک ماہ چھوڑنے کی بدولت ان سے طبعی نفرت اور دوری پیدا ہوجائے۔

دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہم سب کو رمضان المبارک کی روح حاصل کرنے کی توفیق مرحمت فرمائے۔ آمین

گوشۂ رمضان

اعتکاف؛ فضائل وآداب

از: مولانا سید خواجہ نصیر الدین قاسمی*

ماہ رمضان المبارک کا اکثر حصہ گذر چکا ہے، خیر کے طلبگار خیر کی طرف پیش رفت میں مصروف ہیں، ہر مؤمن بندہ نامۂ اعمال میں نیکیوں کی ذخیرہ اندوزی کی فکر میں لگا ہوا اور رمضان کی رحمتوں وبرکتوں سے مکمل استفادہ کے لئے کوشاں ہے، پنجوقتہ نماز وتراویح ،تلاوت وذکر کے اہتمام والے نورانی ماحول میں ہے۔ یقیناً رب کریم ورحیم کے حضور حاضری، عجز ونیاز کا اظہار یہی شانِ عبدیت ہے اور اسلامی شعار ہے، اور ہر مومن ومسلم سے یہی مقصود ومطلوب بھی ہے۔ یقیناً مومنین کے یہ سارے اعمال قربِ خداوندی کا ذریعہ ہیں لیکن ساتھ ہی ایک اور عبادت جو رمضان کے اخیر عشرہ میں ادا کی جاتی ہے، وہ اعتکاف ہے۔ اس میں مومنین تقرب الی اللہ کی اتنی منزلیں طئے کر لیتے ہیں۔ جتنی پہلے دو عشروں میں طئے نہیں کر پاتے۔ نبی پاک علیہ الصلوٰۃ والسلام نے قولاً وعملاً امت کو اس کے اہتمام کی خاص تعلیم فرمائی ہے۔ اس کے فضائل بھی ارشاد فرمائے ہیں۔

لیکن اس عمل کا عموماً اہتمام نہیں کیا جاتا اگر کیا بھی جاتا ہے تو اس کے آداب واحکام سے ناواقفیت کی بناء اس عمل کی روح نکل چکی ہے، صرف بے سود ڈھانچہ رہ گیا ہے۔ اس لئے ذیل میں اعتکاف سے متعلق فضائل ومسائل، احکام وآداب اور مقاصد احادیث مبارکہ کی روشنی میں پیش خدمت ہیں تا کہ ہم سبھی اس مبارک ومسعود سنتِ نبوی سے صحیح فائدہ اٹھا سکیں، اور تقرب الی اللہ کی منازل بہ سہولت اور زیادہ سے زیادہ طے کرسکیں۔

اعتکاف کی فضیلت واہمیت:-

نبی پاک علیہ الصلوہ والسلام کا اس عمل پر مواظبت فرمانا خود اس کی اہمیت وافادیت کا بین ثبوت ہے۔ ام المومنین حضرت صدیقہ عائشہؓ فرماتی ہیں کہ ”ان النبی ﷺ کان یعتکف العشر الاواخر من رمضان حتی توفاہ اللہ ثم اعتکف ازاوجہ من بعدہ“ (بخاری:۲۰۲۶) آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم رمضان کے اخیر عشرہ میں اعتکاف فرمایا کرتے تھے اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد امہات المؤمنین حضرات ازواج مطہرات بھی اس

* استاذ شعبہ عالمیت ادارہ اشرف العلوم حیدرآباد

اہتمام فرماتی تھیں۔

حضرات ابن عباسؓ حضور علیہ السلام کا ارشاد نقل فرماتے ہیں کہ جو شخص اپنے بھائی کے کسی کام میں چلے پھرے اور کوشش کرے اس کے لئے دس برس کے اعتکاف سے افضل ہے اور جو شخص ایک دن کا اعتکاف کرے اللہ کی رضا کی واسطے تو حق تعالیٰ شانہٗ اس کے اور جہنم کے درمیان تین خندقیں آڑ فرما دیتے ہیں، جن کی مسافت آسمان وزمین کی درمیانی مسافت سے بھی زیادہ چوڑی ہے۔(رواہ البیہقی فی شعب الایمان:۹:۳۶۷)

حضرت شیخ الحدیثؒ نے علامہ شعرانیؒ کی کتاب ''کشف الغمۃ'' کے حوالہ سے نبی کریم ﷺ کا یہ ارشاد نقل فرمایا ہے کہ جو کوئی شخص عشرۂ رمضان کا اعتکاف کرتا ہے اس کو دو حج اور دو عمروں کا ثواب ملتا ہے اور جو شخص جماعت والی مسجد میں مغرب سے عشاء تک اعتکاف کرے کہ نماز یا قرآن کے علاوہ کسی سے (بلاضرورت) بات نہ کرے، حق تعالیٰ شانہٗ اس کے لئے جنت میں ایک محل بناتے ہیں۔

(فضائل اعمال ج:۱ص:۶۱۸)

حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام اور آپ ﷺ کی ازواج مطہرات کا اعتکاف کرنے کا معمول، سنت اعتکاف کرنے میں دو حج اور دو عمروں کا ثواب، نفل اعتکاف میں جنت میں ایک محل کی تعمیر اور ایک دن کے اعتکاف سے معتکف اور جہنم کے درمیاں تین ایسی خندقوں کا حائل ہونا جن کی مسافت زمین وآسمان کی درمیانی مسافت سے بھی زیادہ ہو۔ یہ سارے فضائل ان مخلص بندوں اور بندیوں کے لئے ہیں جو اپنے آپ کو فارغ کر کے اعتکاف کیلئے تیار کر لیتے ہوں۔ جو دس روز کا اعتکاف کریں گے وہ دو حج و دو عمرہ اور سنت نبوی کی فضیلت پائیں گے۔ اور جو نفل اعتکاف کریں گے وہ جنت میں محل تعمیر کروالیں گے اور جہنم سے بہت دور کر دیئے جائیں گے اس کے علاوہ رمضان المبارک کی تمام رحمتیں، برکتیں اور دیگر اعمالِ صالحہ کا ثواب وہ مفت میں پائیں گے۔

نفلی اعتکاف:-

جو اللہ کے بندے عشرۂ اخیرہ کے اعتکاف کیلئے وقت نہ نکال پائیں وہ کم از کم یہ تو ضرور کر لیں کہ دن کے اوقات میں اپنے کاموں سے فارغ ہو جائیں مغرب سے لے کر فجر تک ہر رات اعتکاف کی نیت سے مسجد میں قیام کر لیں تاکہ شب قدر نصیب ہو جائے اور اللہ کی بندیاں بھی دن کو کاموں سے فارغ ہو کر رات کو اعتکاف کر لیں تاکہ وہ اس قیمتی موقعہ سے محروم نہ رہیں۔ اس میں دونوں خیر (اعتکاف کا ثواب اور شب قدر) حاصل ہو جائیں گے۔ اس لئے کہ نبی علیہ السلام کا ارشاد گرامی ہے جو اس رات سے محروم رہ گیا گویا وہ سارے ہی خیر سے محروم رہا اور اس کی بھلائی سے محروم نہیں مگر وہ شخص جو حقیقتاً محروم ہی ہے۔ بہر حال اور اعمال کی طرح یہ بھی

ایک مہتم بالشان عمل ہے اس کے لئے جتنی کوشش کی جائے کم ہے۔

اعتکاف کی حقیقت اور اس کی اقسام:-

مسجد میں عبادت کی نیت سے مسجد میں قیام کرنے کا نام اعتکاف ہے۔فقہاء نے اعتکاف کی تین صورتیں بیان فرمائی ہیں(۱)اعتکافِ مسنون(۲)اعتکافِ واجب(۳)اعتکافِ نفل۔

اعتکافِ مسنون:- رمضان کے عشرۂ اخیرہ میں عید کا چاند نظر آنے تک مسجد میں قیام کرنا یہ اعتکاف سنت مؤکدہ علی الکفایہ ہے(یعنی محلہ سے ایک فرد کا اعتکاف مسنون ضروری ہے اگر کوئی بھی نہ کرے تو پورے محلہ والے گنہگار رہوں گے)

اعتکافِ واجب:- نذر مان لینا کہ اتنے دن کا اعتکاف کروں گا۔یا مسنون اعتکاف کو فاسد کردیا تو اس کی قضاء میں یہ اعتکاف واجب ہو جاتا ہے۔

اعتکافِ نفل:- یہ کسی بھی مسجد میں بلا تعیین وقت کیا جاسکتا ہے۔

اعتکافِ مسنون و اعتکافِ واجب کے لئے روزہ شرط ہے اور اعتکاف نفل کے لئے روزہ شرط نہیں ہے۔

(بدائع الصنائع ج:۲ ص:۲۷۴)

مقصدِ اعتکاف:-

(۱) اعتکاف کا ایک سب سے بڑا مقصد شبِ قدر کی تلاش ہے اس لئے کہ شب قدر رمضان کی اخیر عشرہ میں آتی ہے اور اسی کی تلاش کے لئے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک مرتبہ تمام ماہِ رمضان کا اعتکاف فرمایا۔چنانچہ حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ کہتے ہیں نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے رمضان المبارک کے پہلے عشرہ میں اعتکاف فرمایا اور پھر دوسرے عشرہ میں بھی اعتکاف فرمایا پھر ترکی خیمہ سے سر باہر نکال کر ارشاد فرمایا کہ میں نے پہلے عشرہ کا اعتکاف شبِ قدر کی تلاش اور اہتمام کی وجہ سے کیا، پھر اسی وجہ سے دوسرے عشرہ میں بھی ایسا ہی کیا، پھر مجھے کسی بتلانے والے (فرشتہ) نے بتلایا کہ وہ رات اخیر عشرہ میں ہے لہذا جو لوگ میرے ساتھ اعتکاف کر رہے ہیں وہ اخیر عشرہ کا بھی اعتکاف کریں مجھے یہ رات دکھلادی گئی تھی پھر بھلادی گئی۔

روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ اعتکاف کی ایک غرض شب قدر کی تلاش ہے اور جو معتکف ہوتا ہے اس سے یہ رات چوک ہی نہیں سکتی اس لئے کہ وہ مسجد میں پڑا رہتا ہے تو اس کا ہر عمل عبادت ہے اگر وہ اس رات سو بھی گیا تو وہ شب قدر کو عابد ہی شمار ہوگا اور اس بابرکت رات کو پانے والا ہوگا۔

دوسرا مقصد:۔ علامہ ابن قیمؒ فرماتے ہیں کہ اعتکاف کا مقصد اور اس کی روح دل کو اللہ پاک کی ذات سے وابستہ کر لینا ہے کہ سب طرف سے ہٹ کر اسی کے ساتھ مجتمع ہو جائے اور ساری مشغولیتوں کے بدلہ اسی کی پاک ذات سے مشغول ہو جائے اور اس کے غیر کی طرف سے منقطع ہو کر ایسی طرح اس میں لگ جائے کہ خیالات تفکرات سب کی جگہ اس کا پاک ذکر، اس کی محبت سما جائے حتیٰ کہ مخلوق کے ساتھ انس کے بدلہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ انس پیدا ہو جائے کہ یہ اُنس قبر کی وحشت میں کام دے گا اس لئے کہ اس دن اللہ کی پاک ذات کے سوا کوئی نہ مونس ہوگا نہ دل بہلانے والا ہوگا۔ اگر دل اس کے ساتھ مانوس ہو چکا ہوگا تو کس قدر لذت سے وقت گذرے گا۔

فوائد اعتکاف:۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا معتکف کے بارے میں ارشادِ گرامی ہے ’’ھو یعکف الذنوب ویجری له الحسنات کعامل الحسنات کلھا‘‘ معتکف گناہوں سے محفوظ رہتا ہے اور اس کے لئے نیکیاں اتنی ہی لکھی جاتی ہیں جتنی کہ کرنے والے کیلئے لکھی جاتی ہیں۔ (ابن ماجہ:۱۷۸۱)

اس حدیث شریف میں اعتکاف کے دو اہم فائدے معلوم ہوئے ،ایک ثواب کی زیادتی اور دوسرا گناہوں سے اجتناب۔ یہ دونوں ایسے فوائد ہیں جس کے لئے ہر بندہ مومن کوشاں رہتا ہے۔ بعض مرتبہ غفلت ولا پرواہی سے کچھ ایسے اسباب بن جاتے ہیں کہ انسان معصیت میں مبتلاء ہو جاتا ہے۔ اعتکاف کی برکت سے ایسے اسباب سے بھی حفاظت ہو جاتی ہے اور وہ گناہوں سے محفوظ و مامون ہو جاتا ہے۔

اسی طرح بندہ اعتکاف کی حالت میں بہت سے ایسے اعمال سے محروم رہ جاتا ہے جن کا ثواب اعتکاف سے بھی زیادہ بڑھا ہوا رہتا ہے لیکن اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل وکرم سے معتکف کے لئے یہ فیصلہ فرمایا ہے کہ اُسے ان اعمال کا ثواب بھی دیا جائے گا، جو وہ غیر معتکف ہونے کی حالت میں انجام دیا کرتا تھا۔ یہ انعامِ خداوندی ہے اور اسی کی بخشش وعطا ہے۔ بس ہمیں تھوڑی سے توجہ دینی چاہیے تاکہ اعتکاف کے ساتھ ساتھ مفت میں دوسرے اعمال کا ثواب بھی مل جائے۔

اعتکاف سے متعلق کچھ اہم مسائل:۔

☆ اعتکاف مسنون کا آغاز ۲۰؍رمضان المبارک قبل غروب آفتاب سے ہوتا ہے اور عید کا چاند دیکھنے تک رہتا ہے۔

☆اعتکاف ایسے شخص کی طرف سے صحیح ہوسکتا ہے جو مسلمان ہو، عاقل ہو اور بالغ ہو۔ چنانچہ اگر محلہ کی طرف سے نابالغ بچہ اعتکاف کر لے تو اس اعتکاف کا ذمہ محلہ والوں سے ساقط نہیں ہوتا۔ بدستور ان کے ذمہ باقی رہتا ہے۔

☆مرد حضرات اعتکاف ایسی مسجد میں کریں جہاں پنجوقتہ نماز ادا کی جاتی ہو۔

☆عورتیں اعتکاف اپنے گھروں اس جگہ کریں جو نمازوں کیلئے انہوں نے متعین کر لی ہیں، اگر کوئی جگہ متعین نہ ہو تو کسی جگہ کو متعین کر لیں۔

☆ معتکف بلاضرورتِ شرعی وطبعی مسجد سے باہر نہیں نکلے گا۔

☆ معتکف کے لئے روزہ رکھنا بھی ضروری ہے۔

☆ وضوخانہ، غسل خانہ، طہارت خانہ، صحنِ مسجد، نماز جنازہ ادا کرنے کی جگہ، امام ومؤذن کا کمرہ اگر چہ عرفاً مسجد میں شمار ہوتے ہیں لیکن ان جگہوں پر بلاضرورت ٹھہرنے، بیٹھنے سے معتکف کو پرہیز کرنا چاہیے۔

مفسدات اِعتکاف:-

حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ ''السنة علی المعتكف ان لا يعود مريضاً ولا يشهد جنازة ولايمس المرأة ولا يباشرها ولايخرج لحاجة الا لما لا بد منه ولا اعتكاف الا بصوم ولااعتكاف الا بمسجد جامع'' (رواہ ابوداؤد ج:۱ ص:۳۳۵)

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ چند چیزیں ایسی ہیں جو اعتکاف کو توڑ دیتی ہیں ☆ معتکف کا مباشرت کرنا، بوس وکنار کرنا، یا کوئی ایسی حرکت کرنا جس سے معتکف کو غسل کی حاجت ہوجائے۔ ☆ نماز جنازہ میں شرکت یا کسی مریض کی عیادت یا کسی عزیز ورشتہ دار، اپنے شیخ یا کسی عالم دین سے ملاقات کے لئے مسجد سے باہر نکلنا۔

مکروہات اِعتکاف:-

کچھ امور ایسے ہیں جن سے اعتکاف فاسد تو نہیں ہوتا البتہ مکروہ ہوجاتا ہے۔

☆ بالکل خاموش رہنا کوئی عمل نہ کرنا ☆ لایعنی گفتگو کرنا ☆ دنیوی باتیں کرنا خواہ روبرو بیٹھ کر یا موبائیل فون پر ☆ موبائیل فون پر گیمس کھیلنا ☆ اعتکاف میں رہ کر کسی کو فحش یا کم از کم لایعنی SMS بھیجنا، فون کی رینگ ٹونس چیک کرنا، یا کوئی رنگ ٹون تیار کرنا وغیرہ ☆ کسی کی غیبت کرنا یا عیب جوئی میں لگے رہنا یا کسی کو کوئی تکلیف پہونچانا ☆ اعتکاف میں اپنے لئے اتنی جگہ گھیر لینا جس سے دوسرے مصلیوں اور معتکفین کو تکلیف ہو

☆ سامانِ تجارت مسجد میں لاکر فروخت کرنا خواہ وہ عطریات کی شکل میں ہو یا کتابوں کی شکل ہو یا اور کوئی صورت ہو۔ایسے ہی فون پر صرف معاملہ بیع طے کر لینا اگر چہ جائز ہے مگر فون پر اس قدر معاملات ہو کہ دل ودماغ اسی طرف مشغول ہو جائے تو یہ بھی مکروہ ہے تلاوت ذکرواذکار یا تعلیم وتعلم اس قدر بلند آواز سے کرنا کہ دوسرے معتکف کے آرام وعبادت میں خلل ہو۔اور ہر ایسا عمل جو دوسرے مصلی یا معتکف کی ایذاء کا سبب ہو۔ غسل سے فراغت کے بعد ناپاک کپڑے مسجد میں رکھنا۔غسل کی حاجت ہو جائے تو فوراً مسجد سے نہ نکلنا،لڑائی جھگڑا کرنا،غیبت کرنا،جھوٹ بولنا وغیرہ

اعتکاف میں کیا کرنا چاہئے:۔

جب اللہ کے حضور حاضر ہو چکے ہیں،دنیا اور اس کی مشغولیات سے نکل چکے ہیں تو اب اعتکاف کے مقصد کی تکمیل میں لگ جانا چاہئے اور ہر وقت یہی فکر سوار ہو کہ میرا مولیٰ کس عمل سے راضی اور خوش ہوگا۔نوافل کا اہتمام ہو،ذکرواذکار کی کثرت ہو،فرائض میں کوتاہی سے بچیں تکبیر اولیٰ کسی بھی فرض کی فوت نہ ہو۔صلوٰۃ التسبیح، صلوۃ اللیل،صلوٰۃ الحاجۃ،صلوۃ التوبہ خاص طور پر پڑھی جائے۔قرآن پاک زیادہ سے زیادہ پڑھنے کی کوشش کریں،دین کی باتیں پڑھیں سنیں اور سیکھیں،اس میں کسی قسم کی شرم محسوس نہ کریں،خوب آہ وزاری کرے گڑگڑائے،اللہ کے حضور اپنے لئے اہل وعیال کے لئے عزیز واقارب اور دوست واحباب اور ساری امت مسلمہ کے مومنین ومومنات کی مغفرت کیلئے اور دینی ودنیوی حوائج کی تکمیل اور بیماروں کی صحت کیلئے دعائیں کریں۔اپنے مومن بھائی کی کوئی خدمت اور امداد کر سکیں تو کر گزرے۔

بہرحال!کوئی نیکی فوت نہ ہو،کوئی لمحہ ضائع نہ ہو۔جب اعتکاف ختم ہو تو ہم بخشے بخشائے ہوں،گناہوں سے پاک ہوں،اعمال صالحہ ہماری زندگیوں کو متأثر کر چکے ہوں۔

خلاصہ کلام:۔

اعتکاف جیسی عظیم عبادت ہماری کوتاہیوں،غفلتوں اور لاپرواہیوں کی نذر نہ ہو جائے،ساری مصروفیات سے کٹ کر کیا جانا والا یہ مبارک عمل بے سود نہ ہو جائے اور عشرۂ اعتکاف گزر جائے اور مغفرت کا پروانہ نصیب نہ ہو۔۔۔۔۔یہ سارا عمل ضائع ہوگا اور ہم سے بڑا محروم وشقی کوئی نہ ہوگا۔۔۔۔۔تھوڑی توجہ اور طلب سے نیکی ضائع ہونے سے بچ سکتی ہے اور بہت بڑا خیر ہاتھ آ سکتا ہے۔

اللہ ہم تمام کو اس عمل کی توفیق بخشے،اس کے عظیم خیر سے مستفید فرمائے۔آمین

گوشۂ رمضان

تراویح بیس رکعات یا آٹھ؟

ازقلم: مفتی محمد عبدالحمید شاکر قاسمی*

رمضان المبارک کی راتوں کو اللہ تعالیٰ نے غیر معمولی فضیلت عطا فرمائی ہے۔ دن کے روزے اگر بندۂ مومن کو صبر، تقویٰ اور ضبطِ نفس کی تربیت دیتے ہیں تو راتوں کا قیام ایمان کو تازگی، دل کو خشوع اور روح کو قربِ الٰہی عطا کرتا ہے۔ اسی قیامِ رمضان کو نمازِ تراویح سے تعبیر کیا گیا، جو عہدِ نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے لے کر آج تک امتِ مسلمہ کا متواتر اور مسلسل عمل ہے۔ تراویح کی رکعات کی تعداد کے حوالے سے جو آٹھ اور بیس کا اختلاف پایا جاتا ہے، وہ دراصل فقہی و اجتہادی اختلاف ہے، نہ کہ عقیدے یا فرضیت کا، اور اسی نکتے کو سمجھے بغیر اس مسئلے پر گفتگو اکثر شدت اور انتشار کا سبب بن جاتی ہے۔ (حوالہ: سورۃ الاسراء: 79؛ تفسیر ابن کثیر، ج 4، ص 256) قرآنِ کریم نے قیام اللیل کی مشروعیت کو عمومی اور مطلق انداز میں بیان کیا ہے، کسی مخصوص عدد کا تعین نہیں فرمایا۔ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں: وَمِنَ اللَّيْلِ فَتَهَجَّدْ بِهِ نَافِلَةً لَكَ، یعنی رات کے کچھ حصے میں تہجد ادا کیجیے، یہ آپ کے لیے زائد عبادت ہے۔ اسی طرح فرمایا: كَانُوا قَلِيلًا مِّنَ اللَّيْلِ مَا يَهْجَعُونَ، یعنی اللہ کے نیک بندے رات کو بہت کم سوتے تھے۔ ان آیات سے واضح ہوتا ہے کہ شریعت کی نظر میں اصل مقصود رات کا قیام ہے، نہ کہ رکعات کی گنتی، اور یہی اصول نمازِ تراویح کے مسئلے کی بنیاد بنتا ہے۔ (حوالہ: سورۃ الاسراء: 79؛ سورۃ الذاریات: 17؛ تفسیر قرطبی، ج 10، ص 308) نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ذاتی عمل کے بارے میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی روایت بنیادی حیثیت رکھتی ہے۔ وہ فرماتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم رمضان اور غیر رمضان میں گیارہ رکعت سے زیادہ قیام نہیں فرمایا کرتے تھے۔ اس روایت کو بعض حضرات نے آٹھ رکعاتِ تراویح کی دلیل بنایا ہے، حالانکہ محدثین اور فقہاء نے واضح کیا ہے کہ یہ حدیث حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے معمولِ تہجد کو بیان کرتی ہے، نہ کہ امت کے لیے تراویح کی حد بندی کو۔ خود حضرت عائشہؓ کی دیگر روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم قیام کی طوالت کو ترجیح دیتے تھے، نہ کہ رکعات کی کثرت کو۔ (حوالہ: صحیح بخاری، حدیث 1147؛ صحیح مسلم، حدیث 738؛ شرح مسلم للنووی، ج 6، ص 39)

* توپران ضلع میدک تلنگانہ

رمضان میں باجماعت قیام کا آغاز خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے عمل سے ثابت ہے۔ حضرت عائشہؓ بیان فرماتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے چند راتیں صحابہؓ کو مسجد میں قیام کرایا، پھر چوتھی رات تشریف نہیں لائے، اور صبح فرمایا کہ مجھے اندیشہ ہوا کہ یہ تم پر فرض نہ کر دی جائے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جماعت کے ساتھ قیام مشروع ہے، لیکن نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے امت پر آسانی کے لیے اس کا التزام ترک فرمایا، نہ کہ اس کی مشروعیت کو منسوخ کیا۔ (حوالہ: صحیح بخاری، حدیث 1129؛ صحیح مسلم، حدیث 761؛ فتح الباری، ج 4، ص 253) نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے وصال کے بعد جب فرضیت کا اندیشہ باقی نہ رہا تو حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے امت کو ایک امام پر جمع کرنے کا تاریخی فیصلہ فرمایا۔ حضرت عبدالرحمن بن عبدالقاریؒ فرماتے ہیں کہ حضرت عمرؓ نے لوگوں کو حضرت ابی بن کعبؓ کی اقتدا میں جمع کر دیا اور فرمایا: نِعْمَتِ الْبِدْعَةُ هَذِهِ۔ اس اقدام کا مقصد عبادت کو منظم کرنا اور انتشار کو ختم کرنا تھا، نہ کہ کوئی نئی عبادت ایجاد کرنا۔ (حوالہ: صحیح بخاری، حدیث 2010؛ فتح الباری، ج 4، ص 253)

حضرت عمرؓ کے زمانے میں تراویح کی رکعات کی تعداد کے بارے میں متعدد آثار موجود ہیں۔ تابعی بزرگ حضرت یزید بن رومانؒ فرماتے ہیں کہ لوگ حضرت عمرؓ کے دور میں بیس رکعات قیام کرتے تھے۔ یہی روایت امام مالکؒ نے موطا میں نقل فرمائی ہے اور امام بیہقیؒ نے اسے سنن کبریٰ میں متعدد اسانید سے ذکر کیا ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ بیس رکعات کا عمل محض ایک فرد یا شہر تک محدود نہیں تھا بلکہ عہدِ فاروقی کا عمومی معمول تھا۔ (حوالہ: موطا امام مالک، حدیث 250؛ السنن الکبریٰ للبیہقی، ج 2، ص 496؛ مصنف ابن ابی شیبہ، ج 2، ص 393)۔ یہ عمل صرف حضرت عمرؓ تک محدود نہیں رہا بلکہ حضرت عثمانؓ اور حضرت علیؓ کے ادوار میں بھی اسی طریقے پر امت قائم رہی۔ حضرت علیؓ سے مروی ہے کہ انہوں نے رمضان میں لوگوں کو بیس رکعات پر قائم رکھا اور اس پر کسی صحابیؓ نے نکیر نہیں کی، جو اس بات کی واضح دلیل ہے کہ یہ عمل اجماعی حیثیت اختیار کر چکا تھا۔ (حوالہ: مصنف ابن ابی شیبہ، ج 2، ص 393؛ السنن الکبریٰ للبیہقی، ج 2، ص 496؛ فتح الباری، ج 4، ص 253) ائمہ اربعہ کے اقوال بھی اسی تاریخی اور عملی تسلسل کی ترجمانی کرتے ہیں۔ امام ابو حنیفہؒ اور ان کے تلامذہ کے نزدیک تراویح بیس رکعات سنتِ مؤکدہ ہے۔ امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ میں نے مکہ اور مدینہ کے لوگوں کو بیس رکعات ہی پڑھتے پایا۔ امام احمد بن حنبلؒ سے بھی بیس رکعات کا قول منقول ہے، جبکہ امام مالکؒ کے زمانے میں اہلِ مدینہ چھتیس رکعات پڑھتے تھے، جو دراصل طواف کی کثرت کے بدل کے طور پر تھیں۔ (حوالہ: بدائع الصنائع، ج 2، ص 275؛ الام للشافعی، ج 1، ص 191؛ المغنی لابن قدامہ، ج 2، ص 604؛ موطا امام مالک، حدیث 249)۔ آٹھ رکعات کے قائلین کا اصل مدار حضرت عائشہؓ کی حدیث پر ہے، مگر جمہور محدثین نے واضح کیا ہے کہ اس حدیث کو تراویح پر محمول کرنا محلِ نظر ہے، کیونکہ خود صحابہؓ

نے اس سے بیس رکعات مراد نہیں لی۔ اگر یہ حدیث تراویح کی تحدید کے لیے ہوتی تو حضرت عمرؓ، حضرت علیؓ اور دیگر جلیل القدر صحابہؓ اس کے خلاف عمل نہ کرتے۔ (حوالہ: شرح مسلم للنووی، ج6، ص39؛ فتح الباری، ج4، ص254۔) اس پوری بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ تراویح آٹھ یا بیس دونوں صورتوں میں قیامِ رمضان ہے، مگر بیس رکعات کا عمل سنتِ خلفائے راشدین، تعاملِ صحابہؓ اور اجماعِ امت سے ثابت ہے، جبکہ آٹھ رکعات نبی کریم ﷺ کے ذاتی معمولِ تہجد کی اتباع پر مبنی ہیں۔ اس لیے اس مسئلے میں وسعت، تحمل اور امت کے اجتماعی منہج کو سامنے رکھنا ضروری ہے، نہ کہ تشدد اور تفریق کو۔ (حوالہ: صحیح بخاری، حدیث 2010؛ حجۃ اللہ البالغہ، ج1، ص123؛ فتاویٰ جمہور اہلِ علم، ج4، ص273)۔ اور جمہور کا مسلک کے نزدیک نمازِ تراویح کے مسئلے کو سمجھنے کے لیے محض چند روایات پر اکتفا نہیں کیا جاتا بلکہ اصولِ فقہ، تعاملِ صحابہؓ، تسلسلِ امت اور مقاصدِ شریعت کو مجموعی طور پر سامنے رکھا جاتا ہے۔ امام ابو حنیفہؒ کے منہج کی اساس یہی ہے کہ جس عبادت پر صحابۂ کرامؓ کا اجتماعی اور متوارث عمل قائم ہو جائے، وہ سنتِ مؤکدہ کے درجے میں داخل ہو جاتی ہے، اگرچہ اس کی رکعات یا ہیئت میں نبی کریم ﷺ سے ایک سے زائد صورتیں منقول ہوں۔ اسی اصول کے تحت فقہ میں بیس رکعات تراویح کو سنتِ مؤکدہ قرار دیا گیا، کیونکہ یہ وہ صورت ہے جو خلفائے راشدین، بالخصوص حضرت عمر، حضرت عثمان اور حضرت علی رضی اللہ عنہم کے ادوار میں بلا اختلاف رائج رہی۔ (حوالہ: اصول الشاشی، ص289؛ بدائع الصنائع، ج2، ص275؛ فتح القدیر، ج1، ص407) فقہ میں سنتِ مؤکدہ کی تعریف یہ ہے کہ وہ عمل جس پر نبی کریم ﷺ نے مداومت فرمائی ہو یا آپ ﷺ کے بعد صحابۂ کرامؓ نے اس پر دوام اختیار کیا ہو اور اس کا ترک امت میں شاذ سمجھا جاتا ہو۔ نمازِ تراویح بیس رکعات اسی تعریف پر پوری اترتی ہے، کیونکہ عہدِ فاروقی سے لے کر صدیوں تک امت کا تعامل اسی پر قائم رہا۔ یہی وجہ ہے کہ فقہ میں بیس رکعات کا ترک بلا عذر مکروہ شمار کیا گیا ہے، اگرچہ آٹھ رکعات پڑھ لینے سے قیامِ رمضان کا اصل ثواب حاصل ہو جاتا ہے۔ (حوالہ: ردالمحتار، ج2، ص45؛ الدر المختار، ج1، ص456) جمہور کا مسلک دراصل فقہ اور حدیث فہمی کے اس جامع منہج کا تسلسل ہے جس میں روایت اور درایت دونوں کو جمع کیا جاتا ہے۔ جمہور محققین نے تراویح کے مسئلے میں ہمیشہ اعتدال، وسعت اور امت کے اجتماعی منہج پر زور دیا ہے۔ حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ فرماتے ہیں کہ بیس رکعات تراویح خلفائے راشدین کا مسنون طریقہ ہے اور اسی پر امت کا عمل چلا آ رہا ہے، لہٰذا اسے چھوڑ کر آٹھ پر اصرار کرنا فتنہ کا سبب بن سکتا ہے، خصوصاً وہاں جہاں بیس کا تعامل ہو۔ (حوالہ: فتاویٰ رشیدیہ، ص274؛ فتاویٰ جمہور اہلِ علم، ج4، ص273)۔ حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ اور ان کے تلامذہ نے بھی اسی منہج کی تائید فرمائی کہ تراویح کی اصل روح قیام، خشوع اور قرآن کے ساتھ تعلق ہے، نہ کہ محض عدد پر نزاع۔ تاہم

جہاں امت کا غالب اور متوارث عمل بیس رکعات پر ہو، وہاں اسی کو اختیار کرنا اتحادِ امت اور سدِّ فتنہ کے لیے ضروری ہے۔ یہ موقف دراصل حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے اس اصول کی عملی شکل ہے کہ فروعی اختلافات میں مقامی اور اجتماعی عمل کی رعایت کی جائے۔ (حوالہ: حجۃ اللہ البالغہ، ج 1، ص 123؛ فتاویٰ شیخ الہند، ج 1، ص 215) اکابر کے نزدیک آٹھ رکعات کا قول اگرچہ بعض اہلِ علم سے منقول ہے، مگر اسے بیس رکعات کے بالمقابل کھڑا کرنا علمی دیانت کے خلاف ہے، کیوں کہ آٹھ رکعات کے حق میں نہ تو صحابۂ کرامؓ کا اجتماعی تعامل ہے اور نہ ہی خلفائے راشدین کا تسلسل۔ اسی لیے جمہور محققین نے واضح فرمایا کہ آٹھ رکعات کو سنتِ تراویح کہنا درست نہیں، بلکہ یہ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے تہجد کے معمول سے ماخوذ ایک اجتہادی تطبیق ہے۔ (حوالہ: فتاویٰ محمودیہ، ج 7، ص 175؛ شرح مسلم للنووی، ج 6، ص 39) اور نقطۂ نظر میں ایک اہم اصول یہ بھی ہے کہ عبادات میں کثرتِ عمل کو امت کے اجتماعی مزاج کے ساتھ جوڑا جائے۔ بیس رکعات تراویح میں قرآنِ کریم کی زیادہ مقدار سننے اور سنانے کا موقع ملتا ہے، جس کی طرف خود اکابر نے توجہ دلائی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ برصغیر میں رمضان کے دوران مکمل قرآن سنانے کا جو رواج قائم ہوا، وہ بیس رکعات کے ساتھ زیادہ مناسب اور سہل ہے۔ (حوالہ: فتاویٰ جمہور اہلِ علم، ج 6، ص 243؛ احسن الفتاویٰ، ج 3، ص 514) جمہور کے تحقیقی منہج کے مطابق نمازِ تراویح کے مسئلے میں حتمی اور راجح موقف وہی ہے جو تعاملِ صحابہؓ، اجماعِ امت اور ائمہ اربعہ کے متفقہ اقوال سے ثابت ہو۔ اسی بنیاد پر آٹھ رکعات کو نمازِ تراویح قرار دینا درست نہیں بلکہ یہ صریح طور پر خلافِ آثارِ صحابہؓ اور خلافِ اجماعِ عملی ہے۔ حضرت عائشہؓ کی روایت جس میں گیارہ رکعات کا ذکر ہے، جمہور محدثین وفقہاء کے نزدیک تہجد سے متعلق ہے، اور اسے تراویح پر منطبق کرنا اصولِ حدیث اور فہمِ سلف کے خلاف ہے۔ اگر یہ روایت تراویح کی تحدید کے لیے ہوتی تو حضرت عمرؓ، حضرت علیؓ، حضرت ابن عباسؓ اور دیگر صحابہؓ اس کے خلاف کبھی بیس رکعات پر اجتماع نہ کرتے۔ (حوالہ: شرح مسلم للنووی، ج 6، ص 39؛ فتح الباری، ج 4، ص 254؛ مصنف ابن ابی شیبہ، ج 2، ص 393)۔ جمہور اہلِ علم نے بارہا اس امر کی صراحت کی ہے کہ آٹھ رکعات کو تراویح کہنا تاریخی، حدیثی اور فقہی لحاظ سے ناقابلِ قبول ہے۔ حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ فرماتے ہیں کہ تراویح بیس رکعات ہیں، یہی سنتِ خلفائے راشدین ہے، اور اس کے خلاف کہنا بدعت اور گمراہی کا دروازہ کھولتا ہے۔ اسی طرح فتاویٰ جمہور اہلِ علم میں واضح طور پر درج ہے کہ آٹھ رکعات کو سنتِ تراویح کہنا غلط ہے اور اس کی کوئی صحیح بنیاد عہدِ صحابہؓ میں نہیں ملتی۔ (حوالہ: فتاویٰ رشیدیہ، ص 274؛ فتاویٰ جمہور اہلِ علم، ج 4، ص 273) ائمہ اربعہ کے اقوال اس مسئلے میں نہایت واضح اور فیصلہ کن ہیں۔ امام ابوحنیفہؒ، امام شافعیؒ اور امام احمد بن حنبلؒ کے نزدیک نمازِ تراویح بیس رکعات ہے، جبکہ امام مالکؒ کے نزدیک اصل بیس ہی

ہیں، البتہ اہلِ مدینہ کے عمل کے طور پر چھتیس رکعات بھی منقول ہیں، جو بیس کی نفی نہیں بلکہ اس پر اضافہ ہے۔ کسی ایک امام سے بھی آٹھ رکعات کو تراویح قرار دینا ثابت نہیں۔ (حوالہ: بدائع الصنائع، ج 2، ص 275؛ الام للشافعی، ج 1، ص 191؛ المغنی لابن قدامہ، ج 2، ص 604؛ موطا امام مالک، حدیث 249)۔ ائمہ اربعہ کے اس متفقہ موقف کے بعد آٹھ رکعات کے جواز یا ترجیح کی بات کرنا اجماعِ امت کے مقابلے میں شاذ اور ناقابلِ التفات ہے۔ اصولِ فقہ کا مسلم قاعدہ ہے کہ جب کسی مسئلے میں صحابہؓ کا تعامل اور ائمہ کا اتفاق موجود ہو تو اس کے خلاف انفرادی فہم یا جزوی روایت کو قبول نہیں کیا جاتا۔ یہی منہج جمہور اہلِ علم کا ہے اور یہی منہج اہلِ سنت والجماعت کا امتیاز ہے۔ (حوالہ: اصول الشاشی، ص 289؛ فتح القدیر، ج 1، ص 407) لہٰذا اس تحقیقی مطالعہ کا قطعی اور حتمی نتیجہ یہ ہے کہ نمازِ تراویح بیس رکعات سنتِ مؤکدہ ہے، جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے اشارے، خلفائے راشدین کے فیصلے، صحابہؓ کے اجماعِ عملی اور ائمہ اربعہ کے متفقہ اقوال سے ثابت ہے۔ آٹھ رکعات کو تراویح کہنا علمی دیانت کے خلاف اور امت کے متوارث دینی نظام میں خلل ڈالنے کے مترادف ہے۔ جمہور اہلِ علم کے علمی معیار کے مطابق اسی موقف کی ترجیح واجب ہے اور اسی کو امت کے سامنے پیش کرنا حق وصواب ہے۔ (حوالہ: صحیح بخاری، حدیث 2010؛ فتاویٰ جمہور اہلِ علم، ج 4، ص 273؛ ردالمحتار، ج 2، ص 46)

الحاصل: عبادات میں وہی طریقہ اختیار کیا جائے جو سنتِ نبوی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم، سنتِ خلفائے راشدین اور امت کے اجتماعی عمل سے ثابت ہو، اور ایسے شاذ، انفرادی یا بعد کے رجحانات سے اجتناب کیا جائے جو بظاہر سہولت یا توسع کے نام پر دین کی متوارث ہیئت کو کمزور کر دیتے ہیں۔ اس تحقیق میں نصوص قطعیہ، نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے عملی اسوہ، صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے متواتر تعامل اور ائمہ اربعہ کے متفقہ اقوال کی روشنی میں یہ ثابت کیا گیا ہے کہ نمازِ تراویح کی بیس رکعات ہی سنتِ ثابتہ اور امت کا متوارث طریقہ ہیں۔ مقالہ اس امر کی وضاحت کرتا ہے کہ آٹھ رکعات کا تصور نبی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے معمولِ تہجد سے ماخوذ ہے اور تراویح پر غیر منطبق فہم ہے، جسے نہ تعاملِ صحابہؓ کی تائید حاصل ہے اور نہ فقہی اجماع کی۔ تحقیق کا مرکزی مقصد یہ ہے کہ عبادات کے باب میں سنتِ نبوی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم اور سنتِ خلفائے راشدین کی پیروی کو معیار بنانا اور عددی نزاع یا جدت پسندانہ تعبیرات کے ذریعے دینی شعائر میں تخفیف سے اجتناب کرنا ہے۔ بیس رکعات تراویح پر عمل نہ صرف فقہی طور پر راجح بلکہ امت کے اتحاد، سنت کے تحفظ اور دینی تسلسل کے لیے ناگزیر ہے۔

گوشۂ رمضان

از: مدیر

جمعہ و عید

ایک دن جمع ہو جائیں تو دونوں کا ادا کرنا واجب ہے

اگر کبھی عید جمعہ کے دن واقع ہو جائے تو اس کا حکم کیا ہے؟ یعنی کیا دونوں نمازوں کا ادا کرنا ضروری ہے یا ایک کے ادا کرنے سے دوسری ساقط ہو جاتی ہے، جب کبھی ایسی صورتحال پیش آتی ہے تو یہ مسئلہ موضوعِ بحث بن جاتا ہے، اس لئے ذیل میں اس مسئلے کی ضروری وضاحت پیش کی جارہی ہے۔

نماز جمعہ اور نماز عید دو علاحدہ نمازیں ہیں، دونوں کی مشروعیت علاحدہ ہوئی ہے اور دونوں کے دلائل بھی جداگانہ ہیں۔

● نمازِ جمعہ فرض عین ہے، اس کی فرضیت کا منکر کافر ہے کیوں کہ اس کا ثبوت نص قطعی، سنتِ نبوی اور اجماعِ امت سے ہوا ہے، جہاں تک نصِ قطعی کا تعلق ہے تو وہ قرآن کریم میں سورۃ الجمعہ کی آیت نمبر ۶۲ ہے جس میں اللہ تعالیٰ نے اذانِ جمعہ کے بعد سب کام ترک کر کے نماز ادا کرنے کا قطعی حکم فرمایا ہے۔ نیز نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے کہ لوگوں کو جمعہ چھوڑ دینے سے سختی سے روکا جائے ورنہ اللہ تعالیٰ ان کے قلوب پر مہر لگا دیں گے، پھر وہ غافلوں میں سے ہو جائیں گے۔ (مسلم ۲/۵۹۱، احمد، نسائی) نمازِ جمعہ کے فرض ہونے پر پوری امت کا اجماع بھی ہے۔ نمازِ جمعہ ہجرت سے قبل مکہ مکرمہ ہی میں فرض ہوگئی تھی مگر چونکہ مکہ مکرمہ میں اس کا قیام مشکل تھا تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت مصعب بن عمیرؓ کو مدینہ منورہ میں جمعہ قائم کرنے کا حکم فرمایا۔

● عید کی نماز ہجرت کے پہلے سال مشروع ہوئی، پہلی مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے سن دو ہجری میں عید الفطر کی نماز ادا فرمائی، اس کے بعد سے عید الفطر اور عید الاضحیٰ دونوں میں دو رکعت نماز اس کے بعد خطبہ کا اہتمام بلا اذان و اقامت فرماتے رہے۔ (متفق علیہ) لیکن دلائل کی روشنی میں وہ فرضِ عین نہیں ہے، واجب یا فرضِ کفایہ ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ نمازِ جمعہ اور نمازِ عید دونوں علاحدہ علاحدہ وقتوں میں علاحدہ علاحدہ دلائل سے مشروع ہوئے ہیں، ان میں سے ایک فرضِ قطعی ہے دوسرا واجبِ شرعی، اس لئے دونوں کا مستقل ادا ہونا ضروری ہے،

کسی ایک واجب کی ادائیگی دوسرے واجب کی طرف سے کافی نہ ہوگی ۔ چناں چہ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بھی ایسے مواقع پر دونوں نمازیں پڑھایا کرتے تھے۔(ترمذی:۲/ ۶۲)

رہ گئیں وہ احادیث جن سے علامہ ابن قدامہؒ اوران کے ہم مسلک حضرات جمعہ کے سقوط پر استدلال کرتے ہیں تو ان میں سے پہلی حدیث یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے نماز عید کے بعد اعلان فرمایا:''آج کے دن دو عیدیں جمع ہوگئیں، پس جس کا جی چاہے اس کے لئے جمعہ کی طرف سے بھی یہ نماز کافی ہے،ہم تو جمعہ پڑھیں گے انشاء اللہ''(ابن ماجہ:۱/ ۴۹۴،ابوداؤد:۱/ ۲۸۱)غور کیا جائے تو خود اسی حدیث کے الفاظ اس کے صحیح مفہوم متعین کرنے کے لئے کافی ہیں۔''ہم تو جمعہ پڑھیں گے''اس میں واضح قرینہ اس بات کا موجود ہے کہ یہ اعلان ان دیہات والوں کیلئے کیا گیا تھا جو اطراف واکناف سے نمازِ عید ادا کرنے کیلئے جمع ہوئے تھے اوران پر اپنے علاقوں میں جمعہ واجب نہ تھا،ان کیلئے سہولت پیدا کرتے ہوئے یہ اعلان فرمایا گیا کہ ہم اہل مدینہ تو جمعہ پڑھیں گے،کیوں کہ ہم پر واجب ہے،لیکن جن اہل دیہات پر جمعہ واجب نہیں وہ اگر ہمت محسوس کریں اور ٹھیرنا چاہیں تو جمعہ تک ٹھیریں اور اگر جانا چاہیں تو چلے جائیں وہیں ظہر ادا کرلیں تو بھی کافی ہے، جمعہ کی ادائیگی کے لئے دوبارہ آنا ضروری نہیں۔واضح ہو کہ حدیثِ مذکور کا یہ مفہوم جو لیا گیا وہ محض اٹکل اور قیاس سے نہیں بلکہ اسی مسئلے کی دیگر روایات میں موجود تصریح سے اخذ کیا گیا ہے۔

دوسری روایت جس سے سقوطِ جمعہ کے قائلین استدلال کرتے ہیں جو بخاری شریف میں حضرت عثمانؓ کے واقعہ سے متعلق ہے کہ انہوں نے نماز عید پڑھانے کے بعد خطبہ دیا پھر یہ اعلان کیا''لوگو! آج تمہارے لئے دو عیدیں جمع کردی گئی ہیں،پس اطراف سے آئے ہوئے لوگوں میں سے جو یہ چاہے کہ جمعہ کا انتظار کرے تو ضرور کرے جو لوٹ جانے کو پسند کرے تو میں اس کو اجازت دیتا ہوں''۔(بخاری ۷/ ۱۹۲)اب اس حدیث میں **العوالی** —— جو عالیہ کی جمع ہے وہ بقول امام مالک مدینہ کی آبادی سے آٹھ میل کے فاصلہ پر مرتفع علاقہ میں آباد بستیاں تھیں —— کا لفظ اور **من شاء ان یر جع** یعنی جو لوٹ جانا چاہے کے الفاظ واضح ثبوت ہیں اس بات کا کہ سقوطِ جمعہ کا حکم صرف اہلِ دیہات کے لئے تھا جو اطرافِ مدینہ سے نماز عید کیلئے شہر میں آئے ہوئے تھے،نہ کہ اہلِ شہر کے لئے،حتی کہ ایک حدیث میں یہاں تک صراحت ہے کہ اگر کسی کا حرج نہ ہو تو وہ جمعہ کا انتظار کرے اور جمعہ پڑھ کر جائے۔

مذکورہ تفصیل سے یہ بات اچھی طرح واضح ہوگئی کہ جمعہ کے دن عید واقع ہونے کی صورت میں جمعہ کا وجوب ساقط نہیں ہوتا بلکہ بعینہٖ قائم رہتا ہے،یہی جمہور علماءِ اسلام کا موقف ہے،جن حضرات نے اس کے بر خلاف سمجھا ہے وہ اصولی اعتبار سے مرجوح ہے۔فقط و **اللہ تعالیٰ اعلم و علمہ اتم و احکم**

فکر ونظر

وندے ماترم اور اسلامی موقف

از: مفتی مجیب الرحمٰن تمیم قاسمی*

اسلام کی بنیاد خالص توحید پر ہے

مسلمان کی زندگی، اس کی ذہنی و روحانی ساخت اور اس کے پورے دین کا مرکز یہی عقیدہ ہے کہ اللہ وحدہٗ لاشریک لہ ہی خالق ومعبودِ برحق ہے، اہلِ ایمان کی زندگی کا آغاز بھی توحید سے ہوتا ہے اور انجام بھی اسی پر ہوتا ہے۔ مسلمان جہاں کہیں ہو، اس کی زبان، تہذیب، رنگ یا قومیت کچھ بھی ہوسکتی ہے، مگر اس کا دل، اس کی زبان، اس کے اعمال سب کا مرکز صرف ایک ہی ہے: اِنَّ صَلَاتِیْ وَنُسُکِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ۔

میری زندگی کا مقصد تیرے دین کی سرفرازی
میں اسی لئے مسلماں میں اسی لئے نمازی

اِنَّ هٰذِهٖ اُمَّتُکُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً وَّاَنَا رَبُّکُمْ فَاعْبُدُوْن یہ آیت وعقیدہ مومن کے ایمان کی جان، اور اس کی عبادتوں کا محور ہے، اور یہی اس کی نجات کا واحد راستہ بھی۔ اسی لئے اسلام نے ہر اس فکر، نعرے یا عمل سے گریز کی تعلیم دی ہے جو انسان کے دل میں عظمتِ الٰہی کے مقابل کوئی دوسرا مرکزِ تعظیم پیدا کردے۔ قرآن کریم کھلے الفاظ میں بار بار اعلان کرتا ہے کہ شرک دنیا و آخرت کا سب سے بڑا نقصان ہے، اور اللہ تعالیٰ نے اس کے بارے میں انتہائی سخت حکم نازل فرمایا: إِنَّ اللهَ لَا يَغْفِرُ أَنْ يُشْرَكَ بِهٖ یہی وہ بنیاد ہے جس کے باعث اہلِ ایمان شرک کی کسی رمق کو بھی گوارا نہیں کرتے، کیونکہ قرآن نے اسے سب سے بڑا ظلم کہا ہے، اسی حساسیت کے سبب ہر ایسا لفظ، نعرہ یا ترانہ جس میں الوہیت یا عبادت کا پہلو یا شرک کی جھلک بھی ہو، اہلِ توحید کے لیے ایک سنگین معاملہ بن جاتا ہے، مسلمان کے لیے زبان صرف الفاظ کا مجموعہ نہیں؛ یہ ایمان کی ترجمان ہے۔ ''وندے ماترم'' کا مسئلہ اسی اعتقادی بنیاد پر کھڑا ہے، یہ محض کوئی سماجی یا سیاسی اختلاف نہیں، بلکہ ایک عقیدے کا مسئلہ بن جاتا ہے اور ایسے نعروں کا جائزہ لینا اہلِ ایمان کی ذمہ داری ہے۔

* استاذ شعبۂ عالمیت ادارہ اشرف العلوم، حیدرآباد

عقیدۂ الوہیت اور نعرہ "وندے ماترم":

وندے ماترم ایک تاریخی نعرہ ضرور ہے، اور ملک کی سیاسی تحریکات میں اس کا کردار بھی معروف ہے، لیکن اس کے لفظی معنی "اے مادرِوطن! ہم تیری عبادت کرتے ہیں" اسلامی عقیدے کے صریح منافی ہیں، ناول آنند مٹھ میں یہ نظم ایک ایسے منظر کے ساتھ پیش کی گئی جس میں مادرِوطن کو ایک معبودہ تصور کیا گیا۔ نظم کے اشعار میں درگا، سرسوتی اور لکشمی جیسی دیویوں کے نام، صفات اور علامات کو براہِ راست مادرِوطن سے جوڑا گیا ہے۔

یہ بات واضح ہے کہ ادبی تصور جب عبادت اور الوہیت کے دائرے میں داخل ہو جائے تو اس کی شرعی حیثیت بدل جاتی ہے۔ اسلام کے نزدیک "عبادت" اور "سجود" کے الفاظ خاص اللہ کے لیے ہیں، اور کسی انسان، کسی مخلوق، کسی سرزمین حتیٰ کہ والدین تک کے لیے ان کا استعمال جائز نہیں۔ قرآن نے واضح اعلان کیا: اَلَّا نَعْبُدَ اِلَّا اللّٰہَ "ہم صرف اللہ کی عبادت کریں"۔ اس تناظر میں "وندے ماترم" کا بنیادی مفہوم ایک روحانی اور مذہبی نوعیت رکھتا ہے، جو وطن کے لیے تعظیمِ شرکیہ کے مفہوم پر قائم ہے۔ جب کسی نعرے کے الفاظ ہی عبادت کے مفہوم پر قائم ہوں تو اس کی سیاسی یا ادبی توجیہ بھی اسے شرعی قباحت سے نہیں نکال سکتی۔ مسلمان کے نزدیک وطن کی محبت ایک فطری جذبہ ہے، لیکن وطن کو "دیوی" کے روپ میں مقام اُلوہیت پر رکھنا توحید کے خالص تصور کے خلاف ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہندوستان کے سبھی علماء اور مستند دارالافتاءوں نے صاف طور پر اس نعرے سے اجتناب کو ضروری قرار دیا۔

کفر وشرک کے مظاہر اور مذہبی حساسیت:

اسلامی تاریخ میں عقیدۂ توحید کی حفاظت کے لیے انبیاء نے قوموں کی شدید مخالفت برداشت کی، مگر عبادت کو اللہ کے علاوہ کسی کے لیے قبول نہ کیا۔ قرآن کریم نے ان مشرکانہ نعروں اور ان کے اثرات کو کئی مقامات پر بیان کیا، تاکہ معلوم ہو کہ شرک ہمیشہ دل کے اندر سے شروع ہوتا ہے اور پھر نعرے، رسومات اور تہنیت کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ ایسے نعروں کو معمولی سمجھ لینا یا قومی جوش کی آڑ میں ان کو دہرانا مسلمان کے ایمان کے لیے زہرِ ہلاہل ہے، کیوں کہ زبان کا ایک غلط جملہ کبھی کبھی انسان کے عقیدے پر اثر انداز ہو جاتا ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا: "بندہ ایک کلمہ بول دیتا ہے، جس پر وہ توجہ بھی نہیں دیتا، مگر وہ اسے جہنم میں گرا دیتا ہے۔" اس لیے کسی بھی ایسے نعرے یا کلمے کو اپنانا، جو الوہیت، عبادت یا سجدے کے مفہوم پر دلالت کرے، ایمان کی سلامتی کے خلاف ہے۔ مسلمان وطن سے محبت ضرور کرتا ہے، لیکن اس محبت کی نوعیت

عقیدے کے دائرے میں محدود رہتی ہے، نہ کہ مذہبی تقدیس کے درجے تک پہونچتی ہے۔

محبتِ وطن اور اس اسلام کے حدود:

اسلام نے وطن سے محبت کو فطری جذبہ قرار دیا ہے، اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی مکہ سے محبت اس کی روشن دلیل ہے، لیکن اسلام وطن کو ''معبود'' یا ''مقدّس الوہیت'' نہیں بناتا، وطن کی خدمت، اس کی خیر خواہی اور اس کے امن کا قیام اسلام کا حصہ ہے، مگر عبادت صرف اللہ کے لیے خاص ہے، یہی وہ فرق ہے جسے نظر انداز کرنے سے فکری انتشار پیدا ہوتا ہے، ''وندے ماترم'' کے معاملے میں اصل مسئلہ وطن سے محبت نہیں، بلکہ وطن کو اس درجہ تک پہونچانا ہے جو اسلامی عقیدے میں صرف اللہ تعالیٰ کا حق ہے، مسلمان اپنے وطن کے لیے جان بھی دیتا ہے، مگر عقیدے کا سودا نہیں کرتا، مسلمان کیلئے ''حب الوطن'' فطری چیز ہے مگر یہ محبت عقیدۂ توحید کے تابع ہے، اس پر غالب نہیں، ہندوستان کے مسلمان ہمیشہ قومی نظم "جن گن من" پڑھتے ہیں، "جے ہند" جیسے قومی نعروں میں شامل ہوتے ہیں، اور ملک کی ترقی میں حصہ لیتے ہیں۔ لیکن جہاں مادرِ وطن کو معبودہ قرار دینے والی نظم پیش کی جائے، وہاں ایمان ان سے مطالبہ کرتا ہے کہ مؤدبانہ خاموشی اختیار کریں۔ یہ طرزِ عمل نہ اختلاف ہے نہ انکار، بلکہ عقیدے کی حفاظت کا ایک باوقار طریقہ ہے جسے ملک کا آئین بھی جائز قرار دیتا ہے اور جسے اسلامی شریعت بھی فرض بناتی ہے۔

شرکیہ نعرے اور اسلامی موقف:

اسلامی تعلیمات میں شرک کے الفاظ تک سے دور رہنے کی سخت تاکید ملتی ہے۔ اسلامی موقف واضح ہے: ایسے تمام نعروں یا افعال سے اجتناب کیا جائے جن میں شرکیہ تعبیرات یا عبادتی مفاہیم شامل ہوں، چاہے ان کا استعمال کسی قومی جذبے کے تحت کیوں نہ ہو۔ مسلمان اپنی شناخت پر غیرت رکھتا ہے اور اپنے دین کی حرمت پر سمجھوتہ نہیں کرتا۔ علماء نے یہ اصول بیان کیا ہے کہ "الفاظِ شرک بھی شرک کے دروازے کھول دیتے ہیں"۔ مسلمان قوم اپنی تاریخ، فقہ اور ایمان کے نور میں اس بات کو خوب سمجھتی ہے کہ ایمان میں ملاوٹ کا خطرہ الفاظ سے ہی شروع ہوتا ہے۔ وندے ماترم کے شرکیہ حصے اسی خطرے کی واضح مثال ہیں۔ اس لیے دینی غیرت اور ایمان کی حفاظت کا تقاضا یہی ہے کہ مسلمان ان حصوں سے کنارہ کش رہے۔ ملک کا احترام اپنی جگہ، مگر ایمان کی حفاظت اس سے کہیں مقدم ہے۔ دینی فہم رکھنے والے مسلمان ہمیشہ ادب، وقار اور خاموشی کے ساتھ اپنی دین داری کا ثبوت دیتے ہیں اور کسی شرکیہ کلمے کو زبان پر نہیں لاتے۔ دیندار طبقہ دانشمندی کے ساتھ اس مسئلے کو

سمجھے، قوم کے اندر افہام وتفہیم کے ذریعہ صحیح اسلامی نقطہ نظر پہنچائے اور احترامِ وطن کے ساتھ احترامِ ایمان کو بھی مقدم رکھے۔

ایمان کا تحفظ اور اہل ایمان کی ذمہ داری:

اے اہلِ توحید! دنیا کی سب سے قیمتی دولت تمہارا ایمان ہے۔ یہ وہ نعمت ہے جس کے بغیر نہ عبادت قبول ہوتی ہے، نہ آخرت سنورتی ہے، نہ زندگی کا مقصد باقی رہتا ہے۔ ایمان کی حفاظت ایسے ہی ضروری ہے جیسے دل کی دھڑکن؛ اس کے بغیر زندگی ممکن نہیں، آج کے دور میں الفاظ، نعروں، ترانوں اور ثقافتی علامتوں کے ذریعے عقیدوں کو بدلنے کی کوششیں عام ہیں۔ اس لیے اہلِ توحید کو پہلے سے زیادہ چوکس، حساس اور غیرتِ ایمانی سے بھرپور ہونا چاہیے، وندے ماترم کا مسئلہ ہمیں یاد دلاتا ہے کہ مسلمان کا ہر فیصلہ ایمان کی روشنی میں ہوتا ہے، نہ جذبات کی بنیاد پر، نہ دباؤ کے تحت۔ اپنے وطن سے محبت کیجئے، اس کی خیرخواہی کیجئے، امن وترقی میں حصہ لیجئے مگر اپنے ایمان کی حفاظت کو ہر چیز پر مقدم رکھیے۔ یہی مسلمان کی شان ہے، یہی اس کی پہچان ہے، اور یہی وہ روشنی ہے جو اسے قیامت کے دن اللہ کے سامنے سرخرو کرے گی۔

فکر ونظر

جاوید احمد غامدی اور فتنۂ انکارِ حدیث

از: مولانا محمد انصار اللہ قاسمی*

مسلمانوں کو دین اسلام کے سچے اور صحیح راستہ سے گمراہ اور دور کرنے کے لئے ہر دور میں کوششیں کی گئیں، کوششیں اور سازشیں الگ الگ انداز اور نت نئے پہلوؤں سے ہوتی رہیں، ان میں ایک اہم اور خطرناک سازش حدیث وسنت پر سے عام مسلمانوں کے اعتماد اور اعتقاد کو ختم کرنا ہے، کیوں کہ اسلامی تعلیمات کا بڑا حصہ حدیث وسنت کے عظیم سرمایہ سے ماخوذ ہے، اگر مسلمانوں میں اسلام پر عمل کرنے کے سلسلہ میں حدیث کے حجت ہونے کا تصور ختم کر دیا جائے، یا اس کو نا قابل قبول ٹھیرایا جائے تو دین کے بہت سے بنیادی عقائد اور تعلیمات کا انکار کرنا آسان ہو جائے گا، موجودہ دور میں جاوید احمد غامدی کے افکار ونظریات فتنۂ انکارِ حدیث کا ایک تسلسل ہے، البتہ حدیث کا انکار کرنے کے سلسلہ میں جناب جاوید احمد غامدی صاحب کا اپنا ایک طبع زاد خاص انداز اور پیٹرن (Pattern) ہے، اس لئے حدیث وسنت کے حوالہ سے موصوف کے گمراہ افکار و نظریات کو سمجھنے سے پہلے حدیث کے دلیل وحجت ہونے کو جاننا ضروری ہے:

1۔ جو لوگ صرف قرآن مجید کو ماننے کے دعویٰ کرتے ہوئے حدیث کا انکار کرتے ہیں، انھیں معلوم ہونا چاہئے کہ دین میں حدیث کے حجت ہونے کی وضاحت خود قرآن مجید میں ہے۔ چنانچہ قرآن مجید میں مسلمانوں کو بار بار اللہ تعالیٰ کی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی اطاعت کرنے کا حکم دیا گیا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ۔ نبی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی اطاعت کا مطلب یہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم جن کاموں کو کرنے کا حکم دیں اس پر عمل کیا جائے اور جن باتوں سے منع فرمائیں اُن سے رُک جائیں، جیسا کہ قرآن مجید میں ہے "مَا آتَاكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ وَمَا نَهَاكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا (الحشر:7) قرآن مجید میں نماز، روزہ، زکوٰۃ اور حج وعمرہ وغیرہ ارکانِ اسلام ادا کرنے کا صرف حکم دیا گیا، لیکن ان کے ادا کرنے کا کیا طریقہ اور اس کی کیا تفصیلات ہیں، یہ ساری باتیں نبی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے احادیث میں بیان فرمائی، اسی طرح قرآن مجید میں تمام حرام جانوروں کا ذکر نہیں ہے، مثلاً: چیر پھاڑ کرنے

* آرگنائزر مجلس تحفظ ختم نبوت ٹرسٹ واستاذ المعہد العالی الاسلامی حیدرآباد

والے جنگلی جانور وغیرہ ان کے حرام ہونے کا ذکر احادیث میں ہے۔

یہ بات کتنی عجیب اور نا معقول ہے کہ رسول صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو نبی و رسول تو تسلیم کیا جائے لیکن بحیثیت رسول آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم ہماری ہدایت اور نجات کے لئے جو باتیں ارشاد فرمائیں اُس کو یہ کہہ کر رد کر دیا جائے کہ وہ ہمارے لئے دلیل و حجت نہیں ہے، یہ تو ایسا ہی ہے جیسے کوئی اپنے باپ اور والد سے کہے کہ بے شک آپ میرے والد ہیں، میرے لئے قابل احترام ہیں، لیکن میری تعلیم و تربیت کے لئے آپ جو باتیں کہیں گے وہ میرے لئے نا قابل قبول ہیں، اسی طرح کوئی طالب علم اپنے استاذ و ٹیچر سے کہے کہ میں آپ کو اپنا استاد تسلیم کرتا ہوں لیکن دوران تعلیم آپ جو کچھ پڑھائیں گئے میں اُس کو نہیں مان سکتا، کیوں کہ آپ کا پڑھانا میرے لئے حجت نہیں ہے، ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ ایسے نادان اور نا سمجھ آدمی کا اپنے باپ کو باپ اور استاذ کو استاذ ماننا کوئی معنیٰ نہیں رکھتا ہے۔

2۔ امت مسلمہ میں چوں کہ نبی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی احادیث کا انکار کرنے والے لوگ پیدا ہونے والے تھے، اس لئے آں حضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے پہلے ہی امت کو ایسے منکرین حدیث سے ہوشیار و باخبر فرما دیا تھا، آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا:

''اچھی طرح سن لو! مجھے قرآن دیا گیا اور قرآن کے ساتھ اُس جیسا علم بھی (یعنی حدیث) یہ بھی یاد رکھو! کوئی پیٹ بھرا شخص تکیہ سے ٹیک لگائے ہوئے، لوگوں سے کہے گا، لوگو! تمہارے لیے یہ قرآن کافی ہے جو چیز اس میں حلال ملے اُس کو حلال سمجھو اور جو چیز اس میں حرام ہے اُس کو حرم سمجھو، حالاں کہ اللہ کے رسول جس کو حرام فرمائیں وہ بھی اسی طرح حرام ہیں جیسے اللہ تعالیٰ کی حرام کردہ چیزیں ہیں''۔(ابوداؤد: حدیث نمبر:4604)

نبی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی اس سچی پیشن گوئی کے مطابق مسلمانوں میں منکرین حدیث کا فتنہ کھڑا ہوا، ہمارے ملک ہندوستان میں سر سید احمد خان، عبداللہ چکڑالوی، غلام احمد پرویز اور اسلم جیراج پوری وغیرہ مشہور منکرین حدیث گذرے ہیں، ان میں اگرچہ سب نے حدیث کو دلیل و حجت ماننے سے انکار کیا، لیکن انکار کرنے کا انداز اور طریقہ سب منکرین حدیث کا ایک جیسا نہیں تھا، ان میں تین طرح کے لوگ ہیں:

۱۔ ایک گروپ نے تو بالکلیہ سرے سے حدیث کا ایسا انکار کر دیا، گویا کہ اسلام میں حدیث نام کی کوئی چیز ہی نہیں ہے، جیسے اسلم جیراجپوری نے لکھا ہے:

''نہ حدیث پر ہمارا ایمان ہے اور نہ اس پر ایمان لانے کا ہم کو حکم دیا گیا ہے، نہ حدیث کے راوی پر ہمارا ایمان ہے اور نہ اس پر ایمان لانے کا حکم دیا گیا ہے، نہ حدیث کی سند میں جو رجال ہیں ان

پر ہمارا ایمان ہے اور نہ ان پر ایمان لانے کا ہم کو حکم دیا گیا ہے، پھر یہ کس قدر عجیب بات ہے کہ ایسی غیر ایمانی اور غیر یقینی چیز کو ہم قرآن کی طرح دینی حجت مانیں"

(مقام حدیث جلد:1،ص:169، بہ حوالہ انکار حدیث کے نتائج ص:46از حضرت مولانا سرفراز خان صفدر)

۲۔ دوسرا گروپ وہ ہے جس نے آں حضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی باتوں اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے فیصلوں کو اگر چہ حجت مانا ہے، مگر اس لئے نہیں کہ وہ حدیث ہے اور اس لئے بھی نہیں کہ نبی اور رسول ہونے کی حیثیت سے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ باتیں ارشاد فرمائی اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ فیصلے کیئے ہیں، بل کہ اس لئے حجت مانتے ہیں کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنے زمانہ میں حکمراں تھے اور بحیثیت حکمراں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی باتوں اور فیصلوں کو تسلیم کرنا عوام کے لئے ضروری ہے، پس ان کے گمراہ خیال میں نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وہی باتیں اور فیصلے حجت ہیں جو بحیثیت حاکم آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی زندگی میں فرمائے ہیں، اس سلسلہ میں ایک مشہور منکرِ حدیث نے لکھا ہے:

"قرآن میں جہاں جہاں اللہ ورسول کی اطاعت کا حکم دیا گیا ہے، اس سے مراد امام وقت یعنی مرکزِ ملت کی اطاعت ہے، جب تک محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم امت میں موجود تھے، ان کی اطاعت اللہ ورسول کی اطاعت ہوگی اور اطاعت عربی میں کہتے ہیں زندہ کی فرمانبرداری کو، رسول کی اطاعت یہ ہر گز نہیں ہے کہ ان کے بعد جو کوئی ان کے نام سے کہدے ہم اس کی تعمیل کرنے لگیں"

(مقام حدیث جلد، 1،ص155۔ انکار حدیث کے نتائج ص:35)

۳۔ تیسرا گروپ وہ ہے جو احادیث کو حجت مانتا ہے، نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زندگی میں بھی اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دنیا سے پردہ فرما جانے کے بعد بھی۔ البتہ یہ لوگ حدیث کو حجت ماننے کے سلسلہ میں اپنی طرف سے چند شرطیں بھی لگاتے ہیں مثلاً **یہ کہ وہ حدیث ان کی اپنی عقل وفہم کے خلاف نہ ہو، دوسرے یہ کہ وہ حدیث ان کے اپنے گمراہ خیال کے مطابق قرآن مجید کے خلاف نہ ہو، کسی حدیث کے بارے میں قرآن مجید کے خلاف ہونے کا فیصلہ وہ کسی محدث کے حوالہ سے نہیں کرتے، بل کہ خود اپنی سمجھ کے مطابق کرتے ہیں۔**

موجودہ دور میں جاوید احمد غامدی اور عبداللہ طارق وغیرہ منکرین حدیث اس تیسرے گروپ سے تعلق رکھتے ہیں، یہ صرف اُن ہی حدیثوں کو مانتے اور قبول کرتے ہیں جو ان کی مقرر کردہ شرائط پر پوری اترتی ہوں اور اُن کا ذہن ودماغ اُس کو قبول کرتا ہو، اس سے ہٹ کر وہ کسی حدیث کو قبول نہیں کرتے اگر چہ وہ سند اور درجہ کے لحاظ سے کتنی ہی زیادہ صحیح کیوں نہ ہو اور امام بخاری، امام مسلم وغیرہ جیسے اعلیٰ درجہ کے محدثین نے اس حدیث کو اپنی معتبر اور مستند کتابوں میں کیوں نہ نقل کیا ہو۔

3- انکارحدیث کے سلسلہ میں جناب جاوید احمد غامدی کے انداز واسلوب کو سمجھنے کے لئے چند باتوں کو ذہن میں رکھا جائے، مثلاً:

ا) سب سے پہلے یہ بات سمجھنا چاہیئے کہ اگر کوئی شخص ہمیں دین کی باتیں بتانے لگے اور یوں کہنے لگے کہ میں قرآن وحدیث کی روشنی میں تم سے یہ باتیں کہہ رہا ہوں؛ تو اس شخص کی باتوں کو سننے اور قبول کرنے کے لئے ہمارے پاس کیا معیار ہونا چاہیئے؟ یعنی ہم یہ کیسے معلوم کریں کہ یہ آدمی دین کے نام پر اور قرآن وحدیث کا حوالہ دے کر ہمیں صحیح بات بتارہا ہے یا غلط بات؟ سچ کہہ رہا ہے یا جھوٹ؟ اس سلسلہ میں ہمارے لئے تین آپشنس (Options) ہیں:

الف: ایک یہ کہ یہ شخص اپنی بات بہت خوبصورت انداز اور لب ولہجہ میں بتارہا ہے، اس لئے اس کی بات قبول کرلی جائے۔

ب: دوسرے یہ کہ اس شخص کی گفتگو ہمیں اپنے گمان وخیال کے مطابق عقل میں آنے والی اور لاجیکل (logical) معلوم ہورہی ہے، اس لئے اس کی بات مان لی جائے۔

ج: تیسرے یہ کہ اس شخص کی بات قرآن وحدیث سے ثابت ہے، صحابہ کرام ؓ اور بزرگانِ دین نے بھی یہ بات کہی ہے اور مسلمانوں کی اکثریت اس بات کو مان رہی ہے، اس لئے اس کی بات مان لینا چاہیئے۔

ان تین آپشنس میں تیسرا اور آخری آپشن صحیح اور درست ہے، اس کی بنیاد پر ہم فیصلہ کرسکتے ہیں کہ جو شخص ہمیں دین کی باتیں سمجھا رہا ہے، وہ اپنی باتوں میں سچا اور صحیح ہے، اس کی باتوں کو ہم قبول کریں گے، اور اس پر عمل کریں گے، پہلے دو آپشنس اس لئے غلط ہیں کہ محض کسی شخص کا خوبصورت انداز اور نرم لب ولہجہ میں گفتگو کرنا، اس کی بات کے صحیح ہونے کی دلیل نہیں ہے، دنیا کے معاملات میں بھی بہت سے فراڈی اور دھوکہ باز لوگ میٹھی میٹھی باتیں کرکے دوسروں کو اپنا شکار بنالیتے ہیں، محض عقل کی بنیاد پر بھی ہم دین وشریعت کی کسی بات کو نہ قبول کرسکتے ہیں اور نہ جھٹلا سکتے ہیں، کیوں کہ اسلامی عقائد وتعلیمات کی بنیاد قرآن مجید اور احادیث رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ہے، دین کی بہت ساری حقیقتیں وہ ہیں جن کو ہم عقل کی ترازو میں نہیں تول سکتے، مثلاً: معجزات پر ایمان، فرشتوں اور جنت جہنم پر ایمان وغیرہ۔

۲) جاوید احمد غامدی سوشیل میڈیا پر اپنی عقل وسوچ کی مطابق جو دین سمجھا رہے ہیں، ان کی باتوں کے صحیح یا غلط ہونے کا فیصلہ اسی بنیاد پر کیا جائے گا کہ وہ باتیں قرآن وحدیث کے خلاف تو نہیں ہیں؟ کیا صحابہ کرام ؓ نے بھی اسلام کے کسی عقیدہ یا عمل کی اسی طرح تشریح اور وضاحت کی ہے؟ کیا مسلمانوں کی اکثریت ان باتوں

کو مانتی ہے؟ اس انداز سے جب جاوید احمد غامدی صاحب کے افکار ونظریات اور خیالات کی جانچ پڑتال کی جاتی ہے، تو موصوف کی بہت سی باتیں نہایت ہی غلط اور گمراہ کن معلوم ہوتی ہیں، مثلاً:

۱ـ جاوید احمد غامدی **حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے آسمان پر اٹھائے جانے اور قیامت کے قریب زمانہ میں آسمان سے نازل ہونے کا انکار کرتے ہیں، وہ قادیانیوں کی طرح حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو وفات شدہ مانتے ہیں۔**

جب کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا آسمان پر اٹھایا جانا اور قیامت کے قریب زمانہ میں آسمان سے نازل ہونا اور پھر آپ کی وفات ہونا، یہ سب باتیں قرآن وحدیث سے ثابت ہیں، صحابہ کرام ؓ نے ان باتوں کی وضاحت کی ہے، نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مبارک زمانہ سے لے کر آج تک مسلمانوں کی اکثریت ان باتوں کو مانتی آرہی ہے۔

۲ـ جاوید احمد غامدی **قیامت کے قریب زمانہ میں حضرت مہدی کے ظاہر ہونے کا بھی انکار کرتے ہیں،**

جب کہ یہ بات صحیح اور معتبر احادیث سے ثابت ہے، صحابہ کرام ؓ نے اپنی روایات میں حضرت مہدی کے ظاہر ہونے سے متعلق تفصیلات بیان فرمائی ہے اور یہ عقیدہ ہر دور میں اہل سنت والجماعت کے عقائد میں شامل رہا۔

۳ـ جاوید احمد غامدی اپنے خاص پیٹرن میں حدیث کا انکار کرتے ہیں اور یوں کہتے ہیں کہ **احادیث کی تبلیغ وحفاظت کے لئے آں حضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کبھی کوئی اہتمام نہیں کیا۔** (دیکھئے: میزان، ص: ۱۵)

جب کہ یہ بات سراسر غلط ہے، کیوں کہ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا "اللہ تعالیٰ اس شخص کو تروتازہ اور خوش رکھے جو میری بات سنے، اس کو اچھی طرح سمجھے، اس کو یاد رکھے اور دوسروں تک اس کو پہنچائے" (ترمذی، حدیث نمبر: 2658) نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اس ارشاد کی روشنی میں صحابہ کرام ؓ نے آں حضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی احادیث کو سنا اور دنیا کے کونے کونے میں اس کو پہونچایا، پھر نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دنیا سے پردہ فرما جانے کے بعد صحابہ کرام ؓ کے زمانہ میں محدثین (احادیث کا خاص علم رکھنے والے) دور دور سے صحابہ کرام ؓ کی خدمت میں حاضر ہوتے اور ان سے عقیدت ومحبت کے ساتھ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی احادیث سنتے اور اپنے اپنے علاقوں میں جاکر ان احادیث کو عام کرتے، پھر خود نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے منشاً کے مطابق محدثین کی جماعت نے احادیث کی حفاظت کا ایسا کارنامہ انجام دیا کہ صحیح معتبر اور مستند احادیث سے من گھڑت احادیث کو چھانٹ کر الگ کردیا۔

۴ـ جاوید احمد غامدی انکارِ حدیث کے اپنے خاص پیٹرن میں یہ بھی کہتے ہیں کہ **دین میں احادیث**

سے کسی عقیدہ وعمل کا اضافہ بھی نہیں ہوتا‘‘(میزان:15)

حالاں کہ یہ بات بھی بالکل حقیقت وسچائی کے خلاف ہے، شریعت کے احکام کا بڑا حصہ تو احادیث ہی سے ثابت ہے، اور احادیث ہی کی وجہ سے دین میں اس عقیدہ یا عمل کا اضافہ ہوا، مثلاً ارکانِ اسلام نماز، روزہ، زکوٰۃ اور حج وغیرہ کی ادائیگی کا طریقہ اور اس کی تفصیلات اور تقدیر کے عقیدہ کا ذکر احادیث میں ہے۔

4۔ جاوید احمد غامدی صاحب کے افکار ونظریات غلط اور گمراہ ہونے کی ایک اہم اور بنیادی وجہ یہ ہے کہ وہ دینی ومذہبی اصطلاحات (Terminologies) کا معنیٰ ومفہوم ہی بدل دیتے ہیں، جیسے چائے کی پیالی، جب کہا جائے تو اُس کی بناوٹ اور سائز کے اعتبار سے ایک خاص تصور ہمارے ذہن میں ہوتا ہے، کوئی اس کو پیالی کے بجائے کپ بھی کہے تو کوئی زیادہ فرق نہیں پڑتا، لیکن جب اس کو پیالی اور کپ کہنے کے بجائے چائے کا برتن کہا جائے تو پھر پورا معنی ومفہوم ہی بدل جائے گا اور ایک الگ بناوٹ وسائز کے لحاظ سے ایک نیا تصور ذہن میں آئے گا۔ ایسا ہی معاملہ دین وشریعت کی کچھ خاص اصطلاحات کا ہے۔ مثلاً: ۱ء حدیث، ۲ء سنت، اور ۳ء حلال وحرام وغیرہ، ان اصطلاحات کے بارے میں جاوید احمد غامدی کیا کہتے ہیں اور مسلمان کیا سمجھتے ہیں؟ ذیل میں اُس کی وضاحت پیش کی جاتی ہے:

۱ء دین وشریعت کے ماہرین (Experts) کے نزدیک حدیث وسنت سے مراد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ارشادات اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے افعال ہیں، جو بات آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی زبان مبارک سے بیان کی، وہ حدیث ہے اور جو کام آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے عمل کے ذریعہ (practically) سمجھایا اس کو سنت کہتے ہیں، یعنی حدیث اور سنت دونوں الفاظ ایک دوسرے کے اپوزٹ نہیں ہے، دونوں کا معنیٰ ومفہوم قریب قریب ایک ہی ہے۔

اس کے برخلاف جاوید احمد غامدی حدیث اور سنت کے درمیان اتنا زیادہ نمایاں اور واضح فرق بیان کرتے ہیں کہ یہ دونوں الفاظ آگ اور پانی کی طرح ایک دوسرے کی ضد ہوں، اس فرق کو سامنے رکھ کر وہ فیصلہ کرتے ہیں کہ **سنت حجت ہے اور حدیث حجت نہیں ہے،**

جب کہ سنت ہو یا حدیث دونوں کا تعلق نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات گرامی سے ہے، ان دونوں میں سے کسی ایک کو حجت ماننا ایسا ہی ہے جیسے کوئی شخص حیدرآباد میں رہنے والے کو یوں کہے کہ آپ حیدرآبادی تو ہیں لیکن ہندوستانی نہیں ہیں، اب اس نادان کو کون سمجھائے کہ حیدرآباد بھی ہندوستان ہی کا شہر ہے، وہ امریکہ یا جاپان کا علاقہ نہیں ہے۔

۲ء جو علماء دین وشریعت کا گہرا اور پختہ علم رکھتے ہیں، سب یہ کہتے ہیں کہ سنت کا مطلب نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا

مبارک طریقہ ہے، اسی نسبت سے وہ دین پر عمل کرنے کے سلسلہ میں دلیل وحجت ہے، نبی ﷺ کا طریقہ ہونا ہی بذات خود سنت کے حجت ہونے کی بنیاد ہے۔

اس کے برخلاف جاوید احمد غامدی سنت کی ایک الگ ہی تشریح کرتے ہیں، ان کے نزدیک سنت کا مطلب **"دین ابراہیمی کی وہ روایت ہے جسے نبی ﷺ نے اس کی تجدید واصلاح کے بعد اور اس میں بعض اضافوں کے ساتھ اپنے ماننے والوں میں دین کی حیثیت سے جاری فرمایا ہے..."**

(میزان ص: ۱۴)

اس کا مطلب ہوا کہ نبی ﷺ کا عمل اور طریقہ بذات خود سنت نہیں ہے، جب تک کہ اس کی اصل اور بنیاد حضرت ابراہیم علیہ السلام کی تعلیمات میں موجود نہ ہو، اس لئے غامدی صاحب کے یہاں سنتوں کی تعداد صرف 27 / ہے، اس سے ہٹ کر وہ بہت ساری سنتوں کو سنت نہیں سمجھتے اگر چہ کہ وہ رسول اللہ ﷺ کا عمل اور حکم ہی کیوں نہ ہو، پس جب وہ سنت ہی نہ سمجھتے ہوں؛ تو پھر اس کو دین کی حیثیت سے حجت ماننے اور نہ ماننے کا کوئی مطلب ہی نہیں رہ جاتا۔

۳۔ دین وشریعت کے ماہرین اس پر بھی متفق ہیں کہ حلال وحرام وہ چیزیں ہیں جن کو قرآن وحدیث میں حلال وحرام قرار دیا گیا ہے، مثلاً: قرآن مجید میں مردار جانور، غیر اللہ کی تعظیم میں ذبح کیا ہوا جانور، خنزیر اور بہتے خون کو حرام قرار دیا گیا، اسی طرح حدیث میں بھی میں بھی چیر پھاڑ کرنے والے شکاری جانور اور پرندوں کو حرام قرار دیا گیا، کھانے پینے کی چیزوں میں حلال وحرام کا یہی تصور ہے۔

اس کے برخلاف جاوید احمد غامدی اپنے انداز میں حلال وحرام کی ایک الگ تشریح کرتے ہیں، **وہ کھانے پینے سے متعلق کسی چیز کو حلال وحرام قرار دینے کے لئے قرآن وحدیث کی رہنمائی کو بنیاد بنانے کے بجائے اس کو انسان کی فطرت (Nature) پر چھوڑ دیتے ہیں۔** (دیکھئے میزان، ص: ۶۳۲)

اگر انسان اپنی فطرت کی بنیاد پر ہی حلال وحرام کا فیصلہ کرسکتا تو قرآن مجید میں بیان کردہ حرام چیزیں بھی انسانی فطرت پر چھوڑ دی جاتی، انسان جس ماحول میں رہتا ہے، وہ اپنے ماحول اور علاقہ کے کلچر کی وجہ سے کھانے پینے کی بہت سی چیزوں کا عادی ہوتا ہے، ماحول اور علاقائی کلچر کے مقابلہ میں فطرت مغلوب ہوجاتی ہے، چنانچہ بعض ملکوں میں سانپ بچھو اور کیڑے مکوڑے وغیرہ ڈائینگ ٹیبل کی زینت ہوتے ہیں، بہت شوق سے انھیں کھایا جاتا ہے، اب ایسی جگہوں پر حلال وحرام کے لئے قرآن وحدیث اور فقہ اسلامی کو بنیاد بنانے کے بجائے اس کو فطرت پر چھوڑ دیا جائے تو لوگ یقیناً حرام ہی کی طرف جائیں گے، کیوں کہ ماحول اور کلچر کی وجہ

سے فطرتِ سلیمہ مغلوب ہوچکی ہے، جیسا کہ نبی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا: ہر بچہ اسلام کی فطرت پر پیدا ہوتا ہے، اس کے والدین اس کو یہودی، عیسائی یا مشرک بنا دیتے ہیں۔ (ترمذی، حدیث نمبر:2138) پس جیسے سچے اور صحیح دین کو قبول کرنے کے سلسلہ میں ماحول اور تربیت کی وجہ سے انسان کی مسخ شدہ فطرت کو راہِ راست پر لانے کے انبیاءِ کرام کا بھیجا جانا ضروری ہے، اسی طرح حلال وحرام کی تعیین میں انسانی فطرت کی صحیح رہنمائی کے لئے قرآن وحدیث کی تعلیمات کو بنیاد بنانا ضروری ہے، قرآن وحدیث سے بے نیاز ہو کر محض انسانی فطرت کی بنیاد پر کوئی شخص حلال وحرام کی تمیز نہیں کرسکتا۔

غرض یہ کہ یہ دو تین مثالیں ہیں، اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ جاوید احمد غامدی صاحب نے براہ راست اسلام کے کسی حکم یا اصطلاح کا انکار نہیں کیا، بل کہ اس کی ایسی تشریح کی کہ خود بہ خود انکار کی راہ ہموار ہوگئی، پیتل کے سامان کی ایسی ملمع سازی (Coating) کی کہ وہ سونے جیسا نظر آنے لگا، یعنی انھوں نے اپنے غیر اسلامی نظریات اور خیالات کو اسلامی رنگ میں پیش کرنے کی ناکام کوشش کی ہے۔

استفادۂ باطنی کا ایک گُر!

پیش کش: حضرت مولانا مفتی محمد ارشد صاحب بجھیڑی مدظلہ

مفکرِ اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نور اللہ مرقدہٗ نے فرمایا:

''شیوخِ کاملین سے استفادہ اور باطنی ترقیات میں اس کو بڑا دخل ہے کہ اُن کی خدمات کی تکمیل اور ان کے ذوقی مشغلے میں (جو اُن کو دل وجان سے عزیز ہوتا ہے) تندہی، خودفراموشی اور جان کاہی سے رفاقت واعانت کی جائے۔

اہلِ بصیرت کے نزدیک ایک مسترشد (مرید) کو اس سے اپنے شیخ کی جو محبوبیت واعتماد حاصل ہوتا ہے اور اس سے جو باطنی ترقیات حاصل ہوتی ہیں اور جس سرعت کے ساتھ سلوک کے مدارج طے ہوتے ہیں وہ عام طور سے کسی اور راہ سے اور بعض اوقات بڑے بڑے مجاہدات سے بھی نہیں ہوتے۔''

نہ ذکر وورد میں، نَے جبّہ ودستار میں ہے
جو بات شیخ کی نگاہِ پیار میں ہے

نادمؔ

افاداتِ اکابر

اشرف المجالس

ترتیب وپیش کش: مفتی محمد احمد علی صاحب قاسمی*

مخدومنا ومحبوبنا حضرت مولانا محمد عبد القوی صاحب مدظلہ العالی ہر جمعہ بعد نمازِ عصر ہفتہ واری اصلاحی مجلس میں حکیم الامت مجددُ الملت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ کے ملفوظات کچھ توضیح وتشریح کے ساتھ تعلیم فرماتے ہیں، اُن ملفوظات کو قارئینِ اشرف الجرائد وعامۂ مسلمین کے لئے ترتیب دیا گیا ہے۔ ازمرتب

(۵۵) اذیت رسانی راہِ طریقت کا راہزن ہے

ارشاد فرمایا:۔ معاملات ومعاشرت کی درستگی اسلامی تعلیمات کا بہت ہی اہم حصہ ہے، یعنی لوگوں کو رہن سہن اور لین دین میں چوں کہ ایک دوسرے کی ضرورت ہوتی ہے، اس میں اس کے امکانات بہت ہوتے ہیں کہ ہمارے کسی قول وعمل سے کسی دوسرے مسلمان؛ بلکہ غیر مسلمان؛ بلکہ کسی جاندار کو ہم سے تکلیف پہنچے، کیوں کہ جب آدمی مل جل کر رہتے ہیں تو کچھ نہ کچھ ایک دوسرے کو تکلیف پہنچ سکتی ہے، لیکن آدمی جب اپنے اخلاق کی اصلاح کرتا ہے، اور اپنی صفات پر نظر رکھتا ہے، تو پھر اس کے لیے یہ ممکن ہوجاتا ہے کہ اس سے کسی کو تکلیف نہ پہونچے، یہ بات ممکن عملاً ہے، اس لئے کہ جو چیز بندے سے ممکن نہیں اللہ نے اس کو اس کا مکلف بھی نہیں بنایا ہے، اگر کوئی آدمی کہے کہ یہ تو میرے سے ممکن نہیں ہے، یہ تو میں نہیں کرسکتا، تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ وہ اللہ تعالیٰ پر یہ الزام دھرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے طاقت سے زیادہ عمل کا مکلف بنایا ہے، حالاں کہ ایسا نہیں ہے، اللہ تعالیٰ نے تو پہلے ہی فرمادیا: لَا یُکَلِّفُ اللّٰہُ نَفْساً اِلَّا وُسْعَهَا۔ (البقرہ:۲۸۶) اللہ پاک کسی کو بھی اس کی وسعت سے زیادہ کا مکلف نہیں بناتا ہے، یعنی جو دین ہمیں دیا گیا ہے اس کے بارے میں ہمارے پیدا کرنے والے کو معلوم ہے کہ وہ ہماری طاقت سے زیادہ نہیں ہے، لوگ کاہلی اور سستی کی وجہ سے یوں کہتے ہیں کہ ہم سے یہ کام نہیں ہوتا۔ اسی طرح نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی فرمایا ہے: اِنَّ هَذَا الدِّیْنَ یُسْرٌ، (نسائی: ۵۰۳۴) یعنی یہ دین آسان ہے۔

لوگ اس آیت کو یا اس حدیث کو پیش کر کے ترکِ اعمال اور ترکِ عبادات کا بہانہ بناتے ہیں، تو یہ کج فہمی ہے، بات کو غلط سمجھنا ہے؛ کیوں کہ یہ آیت اور یہ حدیث صحابہ کرامؓ کے سامنے بھی تھی کیا صحابہؓ نے اس کا مفہوم ایسا ہی سمجھا؟ جن کے سامنے قرآن نازل ہوا تھا، انہوں نے ایسا سمجھا؟ جب انہوں نے ایسا نہیں سمجھا تو دوسرے کا اس طرح سمجھنا کیسے معتبر ہوسکتا ہے؟ انہوں نے آیت و حدیث کا یہ مطلب سمجھا کہ اللہ اور رسول یہ فرما رہے ہیں کہ بندہ جو کرسکتا تھا اور اس کے لئے جو آسان تھا اُسی کا حکم دیا گیا ہے، اس لیے یہ بھی ہمارے اختیار میں ہے کہ ہم کسی کو تکلیف نہ دینا سیکھ لیں۔

عام طور پر دو چیزوں سے زیادہ تکلیف پہنچ سکتی ہے، زبان سے اور ہاتھ سے، اور کبھی کبھی اشارے کنایے سے بھی تکلیف ہوسکتی ہے، وہ بھی عمل ہے، کسی نے کسی کی طرف ایسا اشارہ کر دیا جس میں اس کی تذلیل و تحقیر ہوگئی تو یہ بھی اس کی دل آزاری اور اذیت رسانی کا ذریعہ ہے، اس لیے فرمایا کہ کسی بھی انسان کو تکلیف پہنچانا جائز نہیں ہے۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ آدمی اپنے طرزِ عمل سے صحیح انداز سے ایک بات بول سکتا تھا جس سے کسی کو اذیت نہ ہو، لیکن وہی بات ایسے عنوان یا ایسی تعبیر سے کہہ دی کہ سامنے والے کی دل آزاری کا سبب بن گئی، ایسا کرنے سے ہمارے نفس کو تو تسکین ہوجاتی ہے مگر اس کے نفس کو تکلیف پہنچتی ہے۔ نفس تو یہی چاہتا ہے کہ کسی نہ کسی طرح دوسروں کو تکلیف پہونچائی جائے، حالاں کہ اس راہ میں سب سے بدتر رہزن مخلوق کو ستانا اور ان پر ظلم کرنا ہے، خواہ کسی عنوان اور کسی طریقے سے ہو، اس لیے اس سے اجتناب کی سخت ضرورت ہے۔

(۵۶) معاصرت سببِ منافرت نہیں ہونا چاہیے

ارشاد فرمایا: ''تحذیر الناس'' حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کی ایک تصنیف ہے، اس کے بعض مضامین پر خواہ مخواہ پورے ہندوستان میں شور مچایا گیا، اور حضرت مولانا پر تہمت لگائی گئی کہ وہ اللہ تعالیٰ کی صفات میں کذب کا امکان مانتے ہیں، اور یہ کہ انہوں نے ختمِ نبوت کا انکار کر دیا ہے، ایسی بات بریلویوں نے خوب چلائی، حضرت مولانا عبدالحئی صاحب فرنگی محلی رحمہ اللہ بھی بڑے پائے کے عالم تھے، ان کو اس عبارت میں کوئی شبہ ہی نہیں ہوا؛ بلکہ اور مضبوط عقیدے کی وضاحت محسوس ہوئی، اور حقیقت بھی یہی ہے کہ وہی سب سے مضبوط عقیدہ تھا، لیکن اس کو غلط شکل دینے والوں نے غلط شکل دی، یہ بات حضرت تھانویؒ نے اس لئے فرمائی کہ عام طور سے علماء کے جو ہم عصر ہوتے ہیں، وہ ایک دوسرے کی موافقت نہیں کر پاتے، جب دل میں اخلاص ہوتا ہے تو پھر آدمی حق بولتا ہے، اور اس میں کسی کی پروا نہیں کرتا۔

افاداتِ اکابر

ارشاد السالکین

”خانقاہِ سعیدیہ“ میں ہر شمسی مہینے کے دوسرے اتوار کو صبح ۹ر بجے تا شب ۹ر بجے اصلاحی مجلس منعقد ہوتی ہے، اس میں جنوبی ہند کی تمام ہی ریاستوں سے تقریباً تین سو سالکین شرکت کرتے ہیں، صبح ۱۰ تا ۱۲ر بجے کی نشست میں شرکاء کے پوچھے گئے سوالات کے جواب مرشدی حضرت اقدس مولانا محمد عبد القوی صاحب مدظلہ العالی خود دیتے ہیں، جو بہت ہی نافع ہوتے ہیں، علماء وعوام سب ہی اس کے قائل ہیں، اس لئے مولانا مفتی محمد احمد علی صاحب قاسمی زید فضلہ استاذ ادارۂ ہذا و مجازِ حضرت والا نے اِن کو جمع کر کے قارئین کے فائدے کے لئے شائع کیا ہے۔ از مرتب

معمولات کے اہتمام کے لئے روزمرہ کے کاموں کے حساب سے وقت طئے کرلینا چاہیے۔

سوال (۹۲):۔اوراد و معمولات کے لیے وقت بدلتے رہتا ہوں، اس سے معمولات میں کوئی حرج تو نہیں ہوتا؟ راہنمائی فرمائیں۔

جواب:۔ہم شروع ہی میں کہہ دیتے ہیں کہ معمولات اپنے حساب سے طے کرلو، آپ نے اگر ایک نظام بنایا تھا، وہ نہیں جما تو دوسرا بنالو، مگر معمولات پورے کرلو، نظام اپنی سہولت سے طئے کر لینے میں کوئی حرج نہیں، کوئی فرض تو نہیں ہے، فرائض کا وقت اللہ نے مقرر کیا ہے، وہ ہم نہیں بتاتے۔اس کو علم کی اصطلاح میں ”مسائلِ توقیفیہ“ کہتے ہیں، جن احکام کا قانون آسمانی اور نبوی ہے، جو امور منصوص ہیں اُن میں تو ہم رد و بدل نہیں کرسکتے، پس جن کاموں کے اوقات منصوص نہیں ہیں ان میں رد و بدل ہوسکتا ہے، اس لئے کوئی حرج کی بات نہیں ہے، جب سہولت ہو کرلیا کرو۔

باطنی گناہوں سے کیسے بچا جائے؟

سوال (۹۳):۔ میں اپنے آپ کو غیبت، حسد، جلن سے کیسے بچاؤں؟ راہ نمائی فرمائیں۔

جواب:۔غیبت سے بچنے کا طریقہ تو یہی ہے کہ ہم ہمت کر کے کسی کا بھی تذکرہ کرنا چھوڑ دیں، شیخ ؒ نے فضائل میں کہیں لکھا ہے کہ جو بھی آپ سے ملنے کے لیے آئے تو آپ اس کو پہلی بات یہ بتادیں کہ بھائی اپنی کہ یا

میری سن، تیسرے کا کوئی تذکرہ نہیں، نہ اچھا نہ برا۔بس اپنے حالات سناؤ اور میرے سنو، ہم دونوں اپنی آپس میں ایک دوسرے کی بات کریں گے، جو یہاں موجود نہیں ہے اس کا ذکر نہیں ہوگا، اچھا بھی نہیں، برا بھی نہیں، اچھا بھی اس لیے نہیں کہ اچھے سے شیطان بات شروع کراتا ہے دھیرے دھیرے غیبت میں لے کے چلا جاتا ہے، اس کی کچھ عرصے تک پابندی کرلیں کہ باہمی گفتگو میں غائبین کا ذکر ہی نہ آئے، اس سے انشاء اللہ غیبت پر قابو ہو جائے گا۔

حسد تو قلب کی بیماری ہے، اوراس کی حقیقت یہ ہے کہ انسان اتنا بخیل ہو جائے کہ دوسرے کے پاس کوئی نعمت دیکھ کراس کا جی جلنے لگے اور یہ تمنا دل کو ستا رہی ہو کہ کسی طرح اس سے یہ نعمت چھن جائے۔ یہ بخل کی انتہا ہے، ایسا بخیل تو جہنم میں جائے گا، حسد کرنا کوئی سمجھداری کی بات نہیں ہے، یہ تو اللہ تعالیٰ کے فیصلوں سے ناراضگی اور مقابلہ ہے۔اس قبیح عادت کو دو طرح سے توڑو، ایک تو عقل سے توڑو، یہی سوچو کہ یہ کون سی عقلمندی کی بات ہے؟ ہم تو کسی کا بھلا نہیں کر رہے ہیں اور اللہ تعالیٰ کر رہا ہے تو وہ بھی برداشت نہیں، یہ کیسی نامعقول بات ہے؟ اللہ تعالیٰ کی دَین پر تو خوشی کا اظہار کرنا چاہیے، اس لیے زبردستی اپنی عقل کے ذریعہ خوشی کا اظہار کرو، طبیعت کی چاہت پر نہ جاؤ، طبیعت کہیں حجت نہیں ہے، طبیعت کے مقابلے میں عقل حجت ہے، اور عقل کے مقابلے میں وحی حجت ہے، بے ایمانوں کے ہاں بھی طبیعت حجت نہیں ہے، طبیعت آندھی ہے، جو چاہنا چاہیے وہ نہیں چاہتی، جو نہیں چاہنا چاہیے وہ چاہتی ہے، جی سے کہو کہ اگر تجھے بھی چاہیے تو دینے والے سے مانگ لے، مگر اس کی نعمت چھن جانے کی تمنا کیوں کرتا ہے؟ یہ تو بالکل بے وقوفی کی بات ہے، جب ہم اپنے آپ کو سمجھائیں گے کہ تیری یہ حرکت بالکل حماقت ہے جہالت ہے، تو یہ عادت ٹوٹے گی، حسد کی بیماری کا دوسرا علاج یہ ہے کہ آپ یہ سوچے کہ میں ایک مومن بندہ ہوں، اور مومن: مومن کہلاتا ہے اللہ کے فیصلوں پر راضی برضا رہنے کی وجہ سے، و القدر خیرہ و شرہ من اللہ تعالیٰ، جو اللہ کردیں وہ خیر ہے، یہ ماننے سے مومن بنتا ہے، اور اللہ نے اس کو یہ نعمت دینا طے کیا ہے، میں اگر اس پر خوش نہ ہوں تو میں اس کے ساتھ بغاوت کر رہا ہوں؟ اس لیے کہ حسد اللہ کے فیصلوں کا مقابلہ ہے، کون کرسکتا ہے اللہ کا مقابلہ؟ اس لئے عافیت وسلامتی کا راستہ اختیار کرو کہ اللہ کے فیصلے پر راضی ہو جاؤ، یہ دو چیزیں بار بار ایسے مواقع پر مستحضر رکھنے سے انشاء اللہ تعالیٰ دھیرے دھیرے لوگوں کی نعمتوں کو دیکھ کر دل کا جلنا ختم ہو جائے گا، اور فطرتاً کچھ اس کا اثر باقی بھی رہ جائے تو یہ وسوسہ ہے جس پر مواخذہ نہیں، وہ غیر اختیاری ہے۔

فقہ وفتاویٰ

آپ کے شرعی مسائل

از: مفتی محمد ندیم الدین قاسمی*

روزہ کی حالت میں وکس لگانا

سوال: کیا روزہ کی حالت میں وکس لگا سکتے ہیں؟

جواب: نزلہ وغیرہ کے وقت جو وکس مرہم لگایا جاتا ہے، جس کی تیز خوشبو دماغ تک پہنچتی ہے، اس کے استعمال سے روزہ نہیں ٹوٹتا۔ (کتاب المسائل، ۲/۱۵۹)

کفارہ کب واجب ہوتا ہے؟

سوال: کفارہ کب واجب ہوتا ہے؟ اور کفارہ کیا ہے؟

جواب: روزہ یاد ہونے کی حالت میں اگر کوئی مکلف شخص رمضان میں جان بوجھ کر بلا کسی اشتباہ کے کوئی دل پسند غذا یا نفع بخش دوا کھا پی کر یا جماع کر کے روزہ توڑ دے تو اس پر قضاء اور کفارہ دونوں لازم ہوتے ہیں۔ اور رمضان کے روزہ کے کفارہ یہ ہے کہ غلام یا باندی آزاد کرے، اگر یہ ممکن نہ ہو (جیسا کہ آج کے دور میں یہ ممکن نہیں ہے) تو لگاتار دو مہینے کے روزے رکھے، درمیان میں ایک ناغہ بھی نہ ہو، ورنہ پھر از سرِ نو رکھنے پڑیں گے، اور اگر اس کی بھی طاقت نہ ہو تو ساٹھ مسکینوں کو دونوں وقت پیٹ بھر کر کھانا کھلائے۔
(کتاب المسائل، ۲/۱۶۹)

اجتماعی اعتکاف

سوال: کیا اجتماعی اعتکاف کرنا جائز ہے؟

جواب: عام حالات میں ایسی مسجد میں اعتکاف کرنا افضل ہے جہاں جمعہ کی نماز ہوتی ہو؛ تاکہ جمعہ پڑھنے کے لئے مسجد سے باہر نہ جانا پڑے، اور یہ مسجد محلہ اور اپنے شہر میں ہو تو بہتر ہے؛ لیکن اگر کسی مصلحت سے دوسرے محلہ کی مسجد میں یا کسی دوسرے شہر میں جا کر اعتکاف کیا جائے تو اس میں بھی شرعاً کوئی حرج نہیں ہے، جیسا کہ آج کل مشائخ اپنے متعلقین اور متوسلین کے ساتھ اعتکاف کرتے ہیں تو اس میں اعتکاف کے ساتھ ساتھ

* استاذ شعبہ عالمیت ادارہ اشرف العلوم حیدرآباد

ان کی تربیت بھی مقصود ہوتی ہے اور یہ اجتماعی اعتکاف تربیت گاہ کی صورت اختیار کر لیتا ہے بشرطیکہ یہ عمل محض رسمی نہ ہو؛ بلکہ دینی فائدہ کو پیش نظر رکھ کر کیا جائے جیسا کہ پیغمبر علیہ الصلاۃ والسلام نے شب قدر کی تلاش میں صحابہ کرام رضی اللہ عنھم کے ساتھ مسجد نبوی میں اجتماعی اعتکاف فرمایا تھا۔ (کتاب المسائل، ۲/۱۹۹)

شیئرز پر زکوٰۃ

سوال: کیا شیئرز پر زکوٰۃ واجب ہے؟

جواب: اگر کسی کمپنی کے شیئرز خرید کر رکھے ہوئے ہوں تو ان کی موجودہ قیمت پر زکوٰۃ واجب ہوگی، یعنی یہ نہیں دیکھا جائے گا کہ انہیں کس قیمت پر خریدا تھا، بلکہ یہ دیکھا جائے گا کہ آج ان کی کیا قیمت ہے؟ اور اسی حساب سے ان کی زکوٰۃ نکالی جائے گی۔ (کتاب المسائل: ۲/۱۳۹)

سفیر کو بطور انعام کچھ رقم دینا

سوال: مدرسہ کے اساتذۂ کرام چندہ کے لیے دوسرے علاقے میں جاتے ہیں اور انعام کے نام پر انہیں کچھ رقم دی جاتی ہے تو کیا انعام لینا جائز ہے؟

جواب: تنخواہ دار اساتذہ اور ملازمین اگر سارا حاصل کردہ چندہ کو ادارہ، مدرسہ کے فنڈ میں جمع کر دیں اور پھر مدرسہ امدادی فنڈ سے حوصلہ افزائی کے طور پر ان کو مقررہ انعام دے تو اس کی گنجائش ہے؛ لیکن یہ انعام پچاس فیصد سے زیادہ نہیں ہونا چاہیے۔

ماہِ شوال کے چھ روزوں کے بعد عید منانا

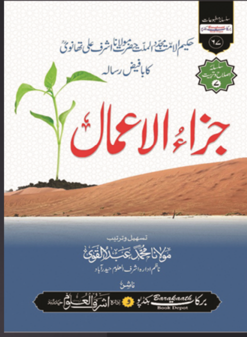
سوال: شوال کے چھ روزے رکھ کر بعض لوگ عید مناتے ہیں کیا اس طرح عید منانا جائز ہے؟

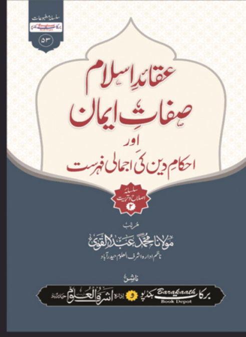
جواب: ماہِ شوال کے چھ روزے رکھنا تو مسنون ہیں؛ البتہ اس کے بعد عید منانا، اس کا شریعت سے کوئی تعلق نہیں، اس رسم کو ترک کر دینا چاہئے۔ (نخبۃ المسائل، ۲/۱۷۸)

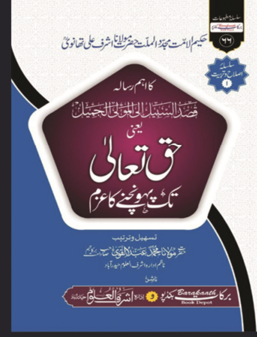
کیا والدہ سے ویڈیو کال پر بات کرنے سے زیارتِ والدین کا اجر ملے گا؟

سوال: کیا والدہ سے ویڈیو کال پر بات کرنے سے زیارتِ والدین کا اجر ملے گا؟

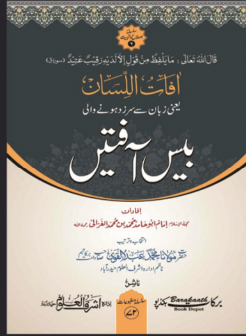
جواب: والدہ کو دیکھنے پر حجِ مقبول کا ثواب ملنے والے مضمون کی روایت سنداً انتہائی ضعیف اور منکر ہے؛ تاہم اگر وہ بالفرض صحیح بھی ہو تو ویڈیو کالنگ سے دیکھنے پر مذکور فضیلت حاصل نہ ہوگی، کیونکہ ویڈیو کے ذریعہ اصل صورت نظر نہیں آتی بلکہ اُس کا عکس نظر آتا ہے، اور شریعت میں عکس کا حکم اصل کی طرح نہیں ہے۔ (جیسا کہ عکس کو دیکھنے سے حرمتِ مصاہرت ثابت نہیں ہوتی۔) (نخبۃ المسائل، ۴/۳۷۶)

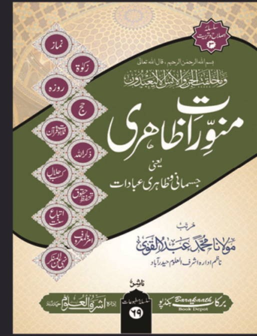


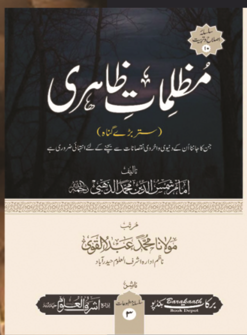


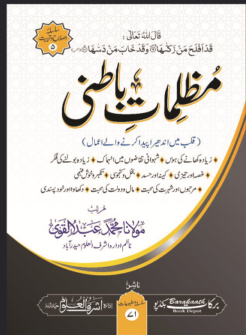


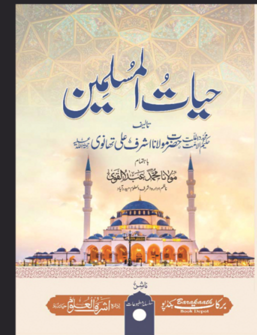












Printer, Publisher & Owner: Mohd Abdul Qavi, # 17-1-391/2, Khaja Bagh, Sayeedabad Colony, Hyderabad- 500059
Published from: # 17-1-391/2, Khaja Bagh, Sayeedabad Colony, Hyderabad- 500059
Editor : Mohammed Abdul Qavi